

پہلا باب

ڈاکٹر عثمانی اور عذاب برزخ

ڈاکٹر عثمانی صاحب کے نزدیک منکر نکیر کے سوال کئے جانے سے پہلے روح کو ایک جسم مثالی میں داخل کیا جاتا ہے یہی جسم مثالی اس کے لئے قبر ہوتا ہے روح کا جسم مادی کے ساتھ جو کہ مٹی میں دبا دیا گیا ہے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ منکر نکیر کے سوال اور عذاب و راحت کے معاملات جسم مثالی پر ہوتے ہیں جسم مادی پر نہیں۔
ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”ان ساری صحیح حدیثوں نے بتلادیا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص وفات پا جاتا ہے اس کو حسب حیثیت ایک برزخی جسم ملتا ہے جس میں اس کی روح کو ڈال دیا جاتا ہے اور اس جسم و روح کے مجموعہ پر سوال و جواب اور عذاب و ثواب کے سارے حالات گزرتے ہیں اور یہی اس کی اصل قبر بنتی ہے“ (ص 9 عذاب برزخ)
اس مجموعہ کو قیامت تک رکھا جائے گا اور اس پر سارے حالات قیامت تک گزریں گے (ص 6 عذاب برزخ)

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اپنا جو عقیدہ ظاہر کیا ہے وہ انہوں نے بعض حدیثوں کو لے کر بنا لیا ہے جبکہ اس موضوع سے متعلق دوسری صحیح احادیث جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عذاب و ثواب کا جسم مادی سے تعلق ہوتا ہے ان حدیثوں کو انہوں نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے جو کہ دیانت کے خلاف ہے اور بڑی ناانصافی ہے۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب کے عقیدے کے خلاف دلائل

1۔ بخاری کی صحیح حدیث ہے۔

عن ابی ہریرہ عن النبی ﷺ قال کان رجل یسرف علی نفسه فلما حضره الموت قال لہنیہ اذا انامت فاحرقونی ثم اطحنونی ثم ذرونی فی الریح فواللہ لئن قدرہ اللہ علی لیعد بنی عذابا ما عذبہ احدا فلما مات فعل بہ ذلک فامر اللہ تعالیٰ الارض فقال اجمعی ما فیک منہ ففعلت فاذا ہو قائم قال ما حملک علی ما صنعت قال مخافتک یا رب فغفر لہ (بخاری ص 495).

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص نے گناہوں کی وجہ سے اپنے نفس پر بڑی زیادتی کی تھی۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو تم مجھے جلا کر میری راکھ کو خوب پیس کر ہوا میں اڑا دینا۔ بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قدرت پائی تو مجھے وہ ایسی سزا دے گا جو اور کسی کو اس نے نہیں دی۔ جب اس کی وفات ہوئی تو اس کے ساتھ ویسا ہی کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کے تمام ذرات کو جمع کر دے سو اس نے ایسا ہی کیا اور وہ آدمی کھڑا موجود ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے جواب دیا تیرے ڈر سے اے میرے رب۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو یہ ڈر ہوا کہ قبر میں میرے جسم مادی پر سخت عذاب ہوگا تو اپنی نادانی سے اس نے یہ خیال کیا کہ اگر میں اپنے جسم مادی کو اس طرح ریزہ ریزہ کر کے اڑا دوں گا شاید اس طرح سے عذاب قبر سے بچ جاؤں گا۔ یہ خیال کرنا کہ وہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری سے خوفزدہ ہوا اور اس نے اس لئے یہ تدبیر کی تو یہ خیال کرنا صحیح نہیں کیونکہ مٹی کی قبر میں دفن کئے جانے کے بعد بھی عام طور سے جسم کچھ عرصے میں ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور پھر بالآخر قیامت کے دن رب کے حضور پیش ہونے پر یقین رکھنا تو ضروریات دین میں سے ہے۔ تو اس شخص کو یہ خوف ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کے مادی جسم پر عذاب واقع کریں گے۔ اگر اس کا یہ عقیدہ غلط ہوتا تو ضروری تھا کہ نبی ﷺ اس قصے کو نقل کر کے عقیدے کی تصحیح فرماتے۔ نبی کا یہ واقعہ بیان کرنا اور مذکورہ شخص کے عقیدے پر انکار نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کا عقیدہ صحیح تھا۔

عن زید بن ثابت قال بینا رسول اللہ ﷺ فی حائط لبنی النجار علی بغلة له ونحن معہ اذ حادث بہ فکادت تلقیہ و اذا اقبر ستہ او خمسہ فقال من یعرف

اصحاب هذه القبر قال رجل انا قال فمتى ماتوا قال فى الشرک فقال ان هذه الامة تبسلى فى قبورها فلولا ان لا تدافنوا لدعوت الله ان يسمعكم من عذاب القبر الذى اسمع منه الخ (مسلم بحواله مشکوٰۃ، باب اثبات عذاب القبر)

حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں اس دوران کہ رسول اللہؐ ہونجار کے باغ میں اپنے نچر پر سوار تھے اور ہم آپ کے ساتھ تھے کہ اچانک آپ کا نچر بدکا اور قریب تھا کہ وہ آپ کو گرا دے۔ ناگاہ سامنے پانچ یا چھ قبریں تھیں آپ ﷺ نے پوچھا کہ ان قبر والوں سے کون واقف ہے۔ ایک شخص نے جواب دیا کہ میں (واقف ہوں) آپ ﷺ نے پوچھا کہ ان کی وفات کب ہوئی تھی اس شخص نے جواب دیا کہ (زمانہ) شرک میں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی ان کی قبروں میں آزمائش کی جاتی ہے اور اگر مجھے ڈرنہ ہوتا کہ تم لوگ مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ جو عذاب قبر میں سن رہا ہوں اللہ وہ تم کو بھی سنوا دیتا۔

اس حدیث میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد فلولا ان لا تدافنوا (اگر یہ ڈرنہ ہوتا کہ تم لوگ مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے) خود اس پر دلیل ہے کہ عذاب اس مٹی کی قبر میں کسم مادی پر ہوتا ہے کیونکہ اگر جسم مثالی پر واقع ہو اور کسم مادی سے کچھ تعلق نہ ہو تو اس کے اعتبار سے دفن کرنا نہ کرنا برابر اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان فضول ہوتا جب کہ آپ ﷺ کے فرمان کا فضول ہونا محال ہے۔

بخاری اور مسلم کی ایک اور صحیح حدیث میں ہے

عن انس قال قال رسول الله ﷺ ان العبد اذا وضع فى قبره و تولى عنه اصحابه انه يسمع قرع نعالهم اتاه ملكان فيقعدانه فيقولان ما كنت تقول فى هذا الرجل لمحمد فاما المومن فيقول اشهد انه عبد الله و رسوله فيقال له انظر الى مقعدك من النار قد ابدلك الله به مقعدا من الجنة فيراهما جميعا و اما المنافق و الكافر فيقال له ما كنت تقول فى هذا الرجل فيقول لا اترى كنت اقول ما يقول الناس فيقال له لا دريت ولا تليت و يضرب بمطارق من حديد ضربة فيصيح صيحة يسمعها من يليه غير الثقلين.

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ جب بندے کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اس سے پھر جاتے ہیں تو وہ ان کی جوتیوں کی چاپ سنتا ہے اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ تم ان صاحب یعنی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتے تھے جو مومن ہوتا ہے وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے بندے اور اسکے رسول ہیں اس سے کہا جائے گا تو اپنے جہنم کے ٹھکانے کو دیکھ جس کو اللہ نے جنت کے ٹھکانے سے بدل دیا ہے وہ مومن دونوں ٹھکانوں کو دیکھے گا اور جو کافر اور منافق ہوتا ہے اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو ان صاحب کے بارے میں کیا کہتا تھا تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا جو لوگ کہتے تھے میں بھی وہی کہتا تھا اس کو کہا جاتا ہے کہ نہ تو نے عقل سے کام لیا اور نہ ہی نقلی دلیل کو اختیار کیا اور اسکو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے جس سے وہ ایسی چیخ مارتا ہے جو سوائے انسانوں اور جنوں کے آس پاس موجود جاندار سنتے ہیں۔

اس حدیث میں کئی ایسی ہیں کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب کا عقیدہ ان کے خلاف ہے

الف۔ ایک بات یہ ہے کہا گیا عن العبد اذا وضع فی قبره (جب بندے کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے) عبد یعنی بندے کے لفظ کا حقیقی معنی اس وقت ہوتا ہے جب جسم انسانی پایا جا رہا ہو فقط روح کو عبد نہیں کہا جاتا دیکھئے قرآن پاک میں بھی ہے سبحن الذی اسرى بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی)

یہ موقع تھا کہ سننے والے خیال کرتے کہ شاید فقط روح مبارکہ کو لے گئے ہوں یعنی معراج روحانی ہوئی جیسا کہ بعض لوگ فی الواقع ایسا اعتراض بھی کرتے ہیں تو اس خیال اور اعتراض کو بعدہ کا لفظ لا کر دفع کیا کہ ہم اپنے بندے کو جسم سمیت لے گئے تھے فقط ان کی کر روح نہیں لے گئے تھے۔

غرض جب عبد کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب جسم انسانی پایا جا رہا تو جسم انسانی یعنی مادی جسم کے ہوتے ہوئے اس کو جس قبر میں رکھا جاتا ہے وہ وہی ہے جو زمین کھود کر بنائی جاتی ہے لہذا ڈاکٹر عثمانی صاحب کا یہ کہنا کہ جسم مثالی ہی اصل میں قبر ہوتا ہے اس حدیث کے خلاف

ہے۔ آگے ہے فیقعدانہ (دو فرشتے اس کے پاس آکر اس کو بٹھاتے ہیں)

سوچنے کی بات ہے کہ وہ فرشتے اس کو کیوں بٹھاتے ہیں جب کہ ڈاکٹر عثمانی کے بقول پہلے سے تیار شدہ جسم میں روح کو ڈالا جاتا ہے تو سوال قیّد ہوتا ہے کہ کیا وہ جسم مثالی پہلے لٹا کر رکھا ہوا تھا یا کسی اور ہیئت میں تھا جو بھی ہیئت تھی قرآن وحدیث سے کی دلیل ضروری ہے اور اگر وہ لٹا کر ہی رکھا ہوا تھا تو یہ کیا وجہ ہے کہ عام ضابطہ ہی ہے کہ فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں وہ ان کے حکم دینے سے پہلے خود کیوں نہیں اٹھ کر بیٹھ جاتا عام ضابطہ کی کوئی وجہ ہونی ضروری ہے اس کا علم بھی ضروری ہے تاکہ دوسرے احتمالات کی نفی ہو سکے علاوہ ازیں عثمانی صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ شہداء کی ارواح کو پرندے کی شکل کے جسم مثالی ملتے ہیں اب اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو اٹھا کر کس طرح بٹھایا جاتا ہوگا؟

ڈاکٹر عثمانی صاحب فقط جسم مثالی کے قائل ہو کر تو ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے البتہ اہل سنت کے نزدیک جواب واضح ہے اور یہ کہ مٹی کی قبر میں میت کو لٹاتے ہیں فرشتوں کے آنے سے پہلے اس جسم مادی کا اس کی روح کے ساتھ اتنا تعلق قائم ہوتا ہے کہ وہ سوال وجواب کے مرحلے سے گزر سکے چونکہ تعلق بقدر ضرورت ہوتا ہے اس لئے اس میں اس سے زیادہ حرکت اور دیگر تقاضوں کا داعیہ بھی پیدا نہیں ہوتا اسی کو اعادہ روح کہا گیا ہے یہ ایسا نہیں ہے کہ دنیا کی طرح پوری روح اس کے جسم میں ڈال دی جاتی ہو اور وہ عالم دنیا کی طرح زندہ اور متحرک ہو جاتا ہو۔

ج۔ حدیث کے آخر میں یہ مضمون ہے فیصیح صیحة یسمعہا من یلیہ غیر الثقلین فرشتوں کے گرز مارنے پر مردہ ایسی چیخ مارتا ہے جو جنوں اور انسانوں کے علاوہ آس پاس اور جاندار سنتے ہیں)

ڈاکٹر عثمانی صاحب اور ان کے پیروکار ذرا سوچیں کہ جب حودان کے بقول جسم مثالی پر عذاب جہنم میں ہوتا ہے تو وہاں آس پاس کونسے انسان اور جن اور دیگر جاندار ہوتے ہیں کہ جن میں سے کچھ کو چیخ سنوائی جاتی ہے اور کچھ کو نہیں وہاں جو انسان قریب میں ہوں گے وہ خود عذاب میں مبتلا ہوں گے اور خود بھی چیخ رہے ہوں گے ایک دوسرے کی چیخ کان میں پڑ جائے گی تو کونسی مصلحت فوت ہوتی ہے؟ ہاں اگر دنیاوی قبر میں جسم مادی پر عذاب واقع ہو اور مردہ

چیتے تو البتہ جنوں اور انسانوں کے اس کو سننے سے مصلحت فوت ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دیا گے جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے فلولوا ان لا تدافنوا لدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر (اگر اس کا ڈرنہ ہوتا کہ تم دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ وہ تم کو عذاب قبر سنوا دے) مذکورہ بالا احادیث اور ان کے مضامین پر غور کرنے سے اہلسنت کے عقیدہ ہی کا صحیح ہونا معلوم ہوا اور وہ یہ ہے کہ قبر میں رکھے جانے کے بعد جسم مادی کے ساتھ روح کا ایک قوی تعلق قائم کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مردہ کو فوٹشتے بٹھا سکتے ہیں اور اس سے سوال و جواب کر سکتے ہیں اعادہ روح سے یہی مراد ہے اور پھر مردے پر عذاب و راحت کے حالات گزرتے ہیں۔ روح کا اصل مستقر مٹی کی قبر میں موجود جسم نہیں ہوتا بلکہ وہ اور مقام ہے نیکیوں کیلئے علیین اور کافروں کیلئے سحجین یا کوئی اور مقام اسکے ساتھ ساتھ اگر بعض کو یا کل کو جسم مثلی بھی ملتا ہو اور روح کا تعلق اس کے ساتھ بھی قائم ہو جاتا ہو تو یہ بھی مستبعد نہیں۔

ہمارے قول پر چند اشکالات و اعتراضات واقع ہوتے ہیں جن کو ذکر کر کے ہم ان کے جواب دیتے ہیں۔

پہلا اشکال:

ڈاکٹر عثمانی صاحب کے الفاظ میں اشکال اس طرح ہے۔

”افسوس کہ آج دنیا والوں کی اکثریت نے اسی دنیا کے ایک خطہ کو وہ قبر ماننا شروع کر دیا جہاں سوال و جواب کے لئے ہر مرنے والے کو اٹھا کر بٹھایا جاتا ہے اور پھر قیامت تک اس کے ساتھ عذاب یا راحت کا معاملہ ہوتا رہتا ہے درآنحالیکہ ہر ایک جانتا ہے کہ کتنوں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے کسی کو درندہ ہڑپ کر جاتا ہے اور کوئی مچھلیوں کے متہ کا نوالہ بن جاتا ہے آخر ان مرنے والوں کو کیسے سوال و جواب وگا اور کس طرح آپر عذاب و راحت کا دور قیامت تک گزرے گا۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ ہر مرنے والے کو قبر دیتا ہے چاہے وہ زمین میں دفن کیا جائے یا کسی درندے کے پیٹ میں جا کر فضلہ بن جائے۔

قتل الانسان ما اکفره من ای شئی خلقه من نطفة خلقه فقد ره ثم السبیل

یسرہ ثم اماتہ فا قبرہ ثم اذا شاء انشرہ۔

”مارا جائے انسان (دشمن حق) کیا ناشکرا ہے کس چیز سے اللہ نے اس کو پیدا کیا؟ نطفہ کی ایک بوند سے اللہ نے اس کو پیدا کیا پھر اس کی تقدیر مقرر کی پھر اس کے لئے زندگی کی راہ آسان کی پھر اسے موت دی اور قبر عطا فرمائی پھر جب اسے چاہے گا زندہ کرے گا۔ (عذاب برزخ ص 2)

جواب

جواب میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اوپر ہم نے جو احادیث ذکر کی ہیں ان سے جو مضامین اور نتائج حاصل ہوتے تھے انکو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں جو قاعدہ ذکر ہے وہ اکثری ہے کلی نہیں ہے۔ دیکھئے ثم اسبیل یسرہ (پھر اس کے لئے زندگی کی راہ آسان کی) تمام انسانوں کیلئے نہیں ہے کیونکہ بعض بچے مردہ پیدا ہوتے ہیں۔

اسی طرح من نطفۃ خلقہ (نطفہ کی ایک بوند سے اللہ نے اس کو پیدا کیا) بھی تمام انسانوں پر صادق نہیں آتا اور حضرت آدم اماں حوا اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی پیدائش نطفہ سے نہیں ہوئی۔

جب ثابت ہوا کہ اس آیت میں جو قاعدہ اور معول ذکر ہے وہ کلی نہیں بلکہ اکثری ہے تو اعتراض خود بخود اٹھ گیا کیونکہ اکثر انسانوں کو بہر حال مٹی کی قبر ملتی ہے اور دین میں بھی جیسا کہ ہائیل وقائیل کے قرآنی قصے سے واضح ہے۔ اصل مردوں کو زمین کے اندر دفن کرنا ہے۔ یہ مان لینے کے بعد کہ اس آیت میں سب انسانوں کی بات نہیں ہے بلکہ اکثر کی ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جل جانے اور درندے کے کھا لینے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ شریعت نے خاص ان کے بارے میں کچھ ذکر نہیں فرمایا البتہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ معاملہ یقیناً فرماتے ہوں گے اس کا ہمیں علم نہ بھی ہو تو مضر نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جل جانے یا درندے کے کھا جانے کی صورت میں بھی مادی جسم معدوم نہیں ہو جاتا صرف اتنا ہے کہ اس کے اجزاء متفرق ہو جاتے ہو جاتے ہیں اور انکی شکل

تبدیل ہو جاتی ہے جیسا کہ اس حدیث سے پتا چلتا ہے جس میں ہے کہ ایک شخص نے عذاب کے ڈر سے اپنی لاش کو جلانے اور راکھ کو اڑانے کی وصیت کی تھی اب سمجھنا چاہئے کہ عالم برزخ میں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا نیز راحت و عذاب کے حالات عالم برزخ میں صرف ایک ذرہ مادی پر واقع ہوں تو یہ بھی کوئی بعید نہیں ہے۔

اعتراض صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا جب ہم یہ کہتے کہ روح کو دوبارہ جسم مادی میں دنیا کے عالم کی طرح داخل کر دیا جاتا ہے۔ جب ہم اس کے قائل ہی نہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ روح تو اپنے مستقر میں رہتی ہے اور وہاں رہتے ہوئے اس کا تعلق جسم مادی سے قائم رہتا ہے۔ تو خواہ جسم کے اجزاء اکٹھے ہوں یا متفرق ہو گئے ہوں کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا دوسرا شکل:

جل جانے اور دررنے کے کھا لینے کی صورت میں کیسے بٹھایا جاتا ہوگا اسی طوح قبر کی کشادگی اور اثر دہوں کا ڈسنا کیسے متصور ہو سکتا ہے۔

جواب

ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے یہاں بھی اور دیگر مقامات میں بھی علمی دامن کو چھوڑ کا عامیانہ انداز کو اختیار کیا ہے اہلسنت کے عقیدے کو وہ صحیح طور پر نہ پیش کرتے ہیں اور نہ ہی خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اہلسنت کہتے ہیں مادی جسم میں دنیا کی طرح نہیں لوٹی کہ زندہ درگور کا معاملہ ہو اور فرشتے قبر و میں آ کر مردے کو بٹھاتے ہیں تو وہ عالم برزخ میں بٹھاتے ہیں ورنہ عالم مادی میں تو ہمیں جسم لیٹا ہوا ہی نظر آتا ہے جیسے عالم خواب میں ایک شخص بیٹھا یا کھڑا ہوتا ہے یا دوڑ رہا ہوتا ہے حالانکہ عالم مادی میں وہ اپنے بستر میں لیٹا ہوا نظر آ رہا ہوتا ہے۔

جب عالم برزخ کے اعتبار سے مردے کے اجزاء کے اکٹھے یا متفرق ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے تو عالم برزخ میں ان اجزاء پر بیٹھنے کی کوئی کیفیت وارد ہو تو تعجب کی کوئی بات ہے۔ اسی طرح قبر کی کشادگی اور اثر دہوں کا ڈسنا عالم برزخ میں ہوتا ہے عالم مادی میں نہیں جیسے عالم خواب میں کوئی زہریلا سانپ کسی کو ڈس لے جب کہ عالم مادی میں وہ سانپ نہیں ہوتا لیکن عالم خواب اور عالم برزخ میں فرق ہے کہ عالم خواب عام طور سے ایک خیالی عالم ہے جب کہ عالم برزخ ایک واقعی عالم ہے۔

تیسرا اشکال:

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”دوران گفتگو یہ بھی کہنے لگتے ہیں کہ نیک انسانوں کی روحیں علیین میں اور برے لوگوں کی تحین میں رکھی جاتی ہیں..... پھر اگر کہا جائے کہ علیین اور تحین روحوں کے رہنے کی جگہیں نہیں بلکہ نیکوکاروں اور بدکاروں کے اعمال ناموں کے دفتر ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کلا ان کتب الفجار لفی سجن کلا ان کتب الابرار لفی علین تو منہ دیکھنے لگ جاتے ہیں گویا یہ بات پہلی مرتبہ آج ہی سنی ہے“ (ص 21 عذاب برزخ)

جواب

ہمیں ڈاکٹر عثمانی صاحب پر تعجب ہے کہ فاضا وفاق المدارس کے مدعی ہونے کے باوجود اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے۔ قرآن پاک میں اعمال ناموں کے دفتر کو علیین اور تحین کہا گیا ہے تو ہم نے یہ کب کہا ہے کہ ان رجسٹروں میں روحیں رہتی ہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں جن جگہوں پر روحیں رکھی جاتی ہیں وہ جگہیں بھی علیین اور تحین کہلاتی ہیں۔ ہاں صرف اتنی بات سے کہ علیین اور تحین دو چیزوں کے نام ہوئے ایک تو رجسٹر کو کہتے ہیں اور دوسرے ایک جگہ کہ کہتے ہیں اور دو چیزوں کا ایک ہی نام ہونا محال نہیں ہے۔

چوتھا اشکال:

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں

”پوچھا جائے کہ پھر قرآن کے اس فرمان کا کیا ہوگا کہ قبر کے مردے بالکل مردہ ہیں ان میں جان کی رمق تک نہیں کہ اموات غیر احیاء“ (ص 15 عذاب برزخ)

جواب

اول تو اس آیت کا مضمّن عالم دنیا اور کالم مادی کے اعتبار سے ہے عالم برزخ کے اعتبار سے نہیں دوسرے ہمارا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ عالم برزے میں مردہ بایں معنی زندہ ہوتا ہے کہ اس میں روح موجود ہوتی ہے بلکہ روح اپنے مستقر میں ہوتی ہے اور وہیں ہوتے ہوئے جسم مادی کے ساتھ اس کا ایک رابطہ اور تعلق قائم رہتا ہے۔ جو حالات عالم برزخ میں جسم مادی پر وارد ہوتے ہیں روح اپنے مستقر میں رہتے ہوئے ان کا ادراک و احساس کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر عثمانی کے عقیدے کے غلط ہونے کی ایک اور دلیل

آخر میں ہم وہ حدیث ذکر کرتے ہیں جسے ڈاکٹر عثمانی صاحب نے خود ذکر کیا ہے اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے ان کا مسلک غلط ہے لیکن پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ روحوں کو جسم مثالی جنت یا دوزخ میں ملتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں ”اب ان دلائل کے بعد کہ نبی ﷺ اور شہداء اپنی دنیاوی قبر میں زندہ نہیں بلکہ عرش الہی کے نیچے اپنے بہترین گھروں میں زندہ ہیں یہ کہا جانے لگتا ہے کہ نبی ﷺ اور شہداء کی بات ہی اور ہے کسی اور کی زندگی کو جنت میں ثابت کیا جائے اس بات کے ثبوت میں بخاری نبی ﷺ کے بیٹے ابراہیم کا واقعہ لائے ہیں (ترجمہ) براء بن عازب روایت کرتے ہیں کہ جب ابراہیم کی وفات ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے جنت میں ایک دودھ پلانے والی ہے۔

اس حدیث سے ابراہیم کا جنت میں موجود ہونا اور ایسے جسم کے ساتھ جو چھاتی سے دودھ کھینچ سکے اسی طرح ثابت ہوا جیسے گزری ہوئی بخاری کی حدیث سے یہ ثابت ہوا تھا کہ عمرو بن لُحی الخزاعی جہنم میں اپنی آنتوں کو گھسیٹ رہا تھا“ (ص 9 عذاب برزخ)

اب وہ حدیث دیکھئے

”آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا لیکن میں نے رات دیکھا کہ دو شخص میرے پاس آئے اور انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور مجھے باہر نکال کر ایک ارض مقدس کی طرف لے گئے..... ہم چلے یہاں تک کہ ایک سرسبز و شاداب باغ میں پہنچے اس میں ایک بڑا درخت تھا اور اس درخت کی جڑ کے پاس ایک بزرگ اور بچے تھے اور درخت کے قریب ایک صاحب تھے جن کے سامنے آگ تھی اور وہ اسے بھڑکا رہے تھے..... (ان دو شخصوں نے بتایا کہ) وہ شخص جو درخت کی جڑ کے پاس تھے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور بچے جو ان کے گرد تھے وہ انسانوں کی اولاد تے اور جو آگ بھڑکا رہے تھے وہ مالک دارغہ جہنم تھے“ (ص 5 عذاب برزخ)

اس حدیث کے الفاظ ”وہ مجھے باہر نکال کر ایک ارض مقدس کی طرف لے گئے“ اور ”ہم چلے یہاں تک کہ ایک سرسبز و شاداب باغ میں پہنچے“ اس بات پر صریح دلیل ہیں کہ وہ

مقام جہنم کا نہیں تھا اور یہ الفاظ ”درخت کے قریب ایک صاحب تھے جن کے سامنے آگ تھی اور وہ اسے بھڑکا رہے تھے“ اس بات پر کھلی دلیل ہیں کہ وہ مقام جنت کا بھی نہیں تھا کیونکہ جنت میں آگ ہونا اور اس کو بھڑکانا بے معنی بات ہے۔

تو معلوم ہوا کہ اجسام مثالیہ نہ جنت میں تھے اور نہ دوزخ میں تے بلکہ الٰہ سے ہٹ کر کسی اور عالم میں تھے اب اگر یہ مان لیا جائے کہ ان اجسام مثالیہ میں روحیں بھی داخل تھیں تو ڈاکٹر عثمانی صاحب کا یہ عقیدہ کہ اجسام مثالیہ صرف جنت یا جہنم میں ہوتے ہیں غلط ثابت ہوتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کیا ارواح تو جنت یا جہنم میں تھیں اور اجسام مثالیہ عالم برزخ میں کسی اور جگہ تھے تو پھر ان اجسام کا ارواح کے ساتھ کوئی ربط و تعلق ماننا پڑے گا۔

دوسرا: باب

ڈاکٹر عثمانی اور عقیدہ حیات النبی ﷺ

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”بخاری نے اس واضح کر دیا کہ جو لوگ نبی ﷺ کو اپنی مدینہ والی قبر میں زندہ مانتے ہیں وہ گویا یہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رفاقت کی بجائے دنیا والوں کی رفاقت کو ترجیح دی تا کہ دنیا والوں کا قبر کے پاس پڑھا ہوا درود و سلام سنیں اور اس کا جواب دیں یہ عقیدہ صرف یہی نہیں کہ باطل ہے بلکہ ان لوگوں نے اپنی غلط بات ثابت کرنے کے لئے نبی ﷺ کو زندہ درگور تک کر دکھایا ہے“ ص 6 (نبی ﷺ اور شہداء اللہ کے پاس جنت میں زندہ ہیں قبروں میں نہیں)

ہمیں افسوس سیکھنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے علم کے نام پر علم کے ساتھ انتہائی نا انصافی کی ہے ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ روح کیلئے ایک مستقر ہے اور وہ وہیں ٹھہرتی ہے البتہ جسم مادی کے ساتھ اس کا ایک تعلق قائم رہتا ہے یہ تعلق متفاوت ہوتا ہے مثلاً شہداء میں یہ تعلق دیگر اموات کے مقابلے میں قوی تر ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے جسم ایک بڑی مدت تک باقی رہتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام میں یہ تعلق تو شہداء سے بھی زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کے اجسام مبارکہ نہ صرف یہ کہ محفوظ رہتے ہیں بلکہ ان سے بعض مخصوص افعال بھی صادر ہوتے ہیں مثلاً نماز پڑھنا۔ مادی دنیا میں گو ہمیں یہ افعال ہوتے نظر نہ آئیں لیکن عالم برزخ جو کہ ہماری آنکھوں سے اوجھل عالم ہے وہاں واقع ہوتے ہیں۔

اہلسنت کا حیات النبی کے نام سے جو عقیدہ ہے وہ فقط اتنا ہے جو ہم نے ذکر کیا یہ حیات عالم برزخ میں ہوتی ہے لیکن چونکہ قوی ترین تعلق کی بنا پر عالم برزخ میں اس مادی جم کے

ساتھ نماز پڑھتے ہیں اس لئے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ کی حیات دنیا کی سی ہے۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اہلسنت کے عقیدہ کو صحیح طور سے سمجھا ہی نہیں اور جو غلط سلط سمجھا اس کو اہلسنت کی طرف منسوب کر کے ان کو قرآن وحدیث کا مخالف کہنے لگے یہ تعجب کی بات ہے حالانکہ ان کا عقیدہ قرآن پاک کے عین موافق ہے۔

اہلسنت کے عقیدہ کا قرآن کے موافق ہونا

اہلسنت کا جو عقیدہ ہم نے ذکر کیا ہے یہ قرآن پاک کے عین موافق ہے قرآن پاک میں ہے۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منا مھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری (سورۃ زمر آیت 42)

اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرا دیا ہے اور چھوڑ دیتا ہے دوسروں کی ایک مقررہ قوت تک۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارواح کو نیند میں کھینچ لیتے ہیں تو سوائے ہوئے آدمی کی روح اس کے جسم سے خارج ہوتی ہے لیکن جسم سے افعال تک صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً کروٹ بدلنا، ٹانگ سکیڑنا، بولنا یہاں تک کہ بعض لوگ تو نیند میں چلنا شروع کر دیتے ہیں اور بچے اپنا سبق دہرانے لگتے ہیں۔

دیکھئے جو عقیدہ ہم نے بیان کیا وہ اس کیفیت کے ساتھ موافقت رکھتا ہے روح جسم مادی سے علیحدہ اپنے مستقر میں رہے البتہ جسم کے ساتھ اس کا تعلق ہو جو اگر قوی ترین ہو تو جسم سے نماز کا فعل صادر ہونے لگے بس اتنا فرق ہے کہ نیند میں ہمیں جسم سے صادر ہونے والے افعال کا شعور نہیں ہوتا اور عالم بزرخ میں یہ شعور ہونا ناممکن نہیں۔

بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھائیے تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تو بعینہ یہ معاملہ حیات دینیوی میں پیش آتا تھا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان عینی تنامان ولا ینام قلبی (میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا) (بخاری ج 1 ص 154)

اس حدیث کے ساتھ جب مذکورہ بالا آیت کا مضمون ملائیے تو بات یہ بنے گی کہ نیند کے

وقت رسول اللہ ﷺ کی روح مبارکہ آپ کے جسم مبارک سے خارج ہوتی ہے لیکن روح کے ساتھ قوی ترین تعلق کی بناء پر آپ کا قلب مبارک کام کرتا رہتا ہے اور آپ ﷺ کو نیند کی حالت میں بہت سے امور کا شعور و ادراک بھی حاصل رہتا ہے۔

غرض عقیدہ حیات النبی کی جو تفصیل ہم نے ذکر کی ہے اس کے مطابق نہ تو رسول اللہ ﷺ کا قبر مبارک میں نماز پڑھنا مستبعد ہے اور نہ ہی آپ ﷺ کا کسی کے آپ کی قبر مبارک پر درود و سلام کو سننے میں اشکال ہو سکتا ہے۔

تیسرا باب

ڈاکٹر عثمانی اور دعائیں وسیلہ کا مسئلہ

دعائیں وسیلہ کی مندرجہ ذیل چند صورتیں ہیں۔

- 1- زندہ بزرگ سے دعا کرانا۔
- 2- میت سے دعا کی درخواست کرنا۔
- 3- اللہ تعالیٰ سے دعائیں غیر اللہ کا واسطہ دینا خواہ وہ واسطہ عمل کا ہو یا کسی صاحب عمل کا ہو یا کسی کے حق کا ہو۔

دعائیں وسیلہ کی پہلی صورت

ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی صاحب نے اپنے راسلہ ”وسیلہ کا شرک“ میں پہلی صورت یعنی زندہ بزرگ سے دعا کرانے کو جائز کہا ہے اور یہ بات صحیح ہے جس کی دلیل میں وہ حدیثیں ہیں جو خود ڈاکٹر عثمانی صاحب نے ذکر کی ہیں۔

دعائیں وسیلہ کی دوسری صورت یعنی میت سے دعا کی درخواست کرنا

سوائے اس صورت کے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس کھڑے ہو کر کوئی شخص آپ ﷺ سے دعا کی درخواست کرے کہ یہ جائز ہے باقی وہ تمام صورتیں جن میں کسی میت یا غائب سے دعا کی درخواست کی جائے ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ احتیاط اسی میں ہے کہ ان سے پرہیز کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر جا کر آپ سے دعا کی درخواست کرنا البتہ سلف صالحین سے ثابت ہے اس کی بنیاد حیات النبی کا عقیدہ ہے جس کی تفصیل اور دلیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

دعائیں وسیلہ کی تیسری صورت

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اس تیسری صورت کی مکمل نفی کی ہے اس کی بعض شقوں کو انہوں نے ذکر بھی نہیں کیا اور بعض کو ذکر کر کے ان کو شرک قرار دیا ہے لکھتے ہیں۔

”غرض اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے صدقے اور وسیلے کے علاوہ ہر دوسری ذات اور اس کی صفات کے صدقے اور وسیلے کو ناجائز اور شرک قرار دیتا ہے۔“

”اب اگر کوئی اسماء حسنی کے بجائے اس کے کسی نبی یا ولی کا نام لے کر کہتا ہے کہ اپنے اس پیارے نبی یا ولی کے صدقہ میں میری دعا قبول فرما کر میری حاجت پوری کر دے تو گویا وہ اللہ کی ذات و صفات کے اسماء حسنی سے زیادہ اس نبی یا ولی کی ذات اور اس کے نام کو موثر مانتا ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے بندہ کو شریک ٹھہرانا ہی نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شدید توہین بھی ہے۔“ (ص 8 وسیلے کا شرک)

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اس صورت کی نفی کر کے اور اس کو شرک قرار دے کر بڑی نا انصافی کی ہے کیونکہ یہ صورت اور اس کی شقیں خود صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

دعا میں عمل کا واسطہ

9109. (ابن عمر) رفعہ: وانطلق ثلاثہ نفر ممن کان قبلکم حتی اوامہم

المبیت الی غار فدخلوه، فاندحدرت صغرة من الجبل فسدت علیہم الغار، فقال انه لا ینجیکم من هذه الصخرة الا ان تدعوا اللہ بصالح اعمالکم، فاقبل رجل منهم اللهم کان لی ابو ان شیخان کبیران، و کنت لا اغبق قبلہما اہلا ولا مالا فنانی بی طلب شجر یوما فلم ارح علیہما حتی ناما، فحلبت لہما غبوقہما فوجدتہما نائمین، فکرت ان اغبق قبلہما اہلا او مالا، فلبثت و القدح علی یدی انتظر استیقاظہما حتی برق الفجر زاد بعض الرواة والصبیبة یتضاغون عند قدمی، فاستیاقظا فشر با غبوقہما اللهم ان کنت فعلت ذلک ابتغاء و جھک ففرج عنا مانحن فیہ من هذه الصحرة فانفرجت شیئاً لا یتسطیعون الخروج قال النبی ﷺ قال الاخر: اللهم کانت لی ابنة عم کانت احب الناس الی فارادتہا علی نفسہا و امتنعت منی حتی الممت بہا سنة من السنین، فجاءتني فاعطیتہا عشرين و مائة دینار علی ان تخلی بینی و بین نفسہا ففعلت، حتی اذا قدرت

علیہا قالت لا یحل لک ان تفض الخاتم الا بحقه فتحرجت عن الوقع علیہا فانصرفت عنہا، وبی احب الناس الی، و ترک الذہب الذی اعطیتہا، اللہم ان کنت فعلت ذلک ابتغاء و جہک فافرج عنا ما نحن فیہ، فانفرجت الصخرۃ غیر انہم لا یتسطیعون الخروج منها قال النبی ﷺ وقال الثالث: اللہم استاجرت اجراء واعطیتہم اجرہم غیر رجل واحد ترک الذی لہ و ذہب فشمزت اجرہ حتی کثرت منہ الاموال، فجائنی بعد حین، فقال یا عبد اللہ ادالی اجری، فقلنتہ گل ماتری من اجرک من الابل والبقر والغنم والرقیق، فقال یا عبد اللہ: لا تستہزی بی فقلت انی لا استہزی بک، فاحذہ کلہ فاستاقہ فلم یتربک منہ شینا اللہم ان کنت فعلت ذلک ابتغاء و جہک فافرج عنہا مانحن فیہ، فانفرجت الصخرۃ فخر جوایمشون، للشیخین و ابی دائود.

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین آدمی جو تم سے پہلی امت میں تھے سفر میں چلے۔ یہاں تک کہ وہ رات کے وقت آرام کیلئے ایک غار میں داخل ہوئے اتنے میں پہاڑ پر سے ایک چٹان نیچے لڑھک کر آئی اور اس نے غار کا منہ بند کر دیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اس چٹان سے تمہیں کوئی چیز نہیں بچائے گی مگر یہ کہ تم اللہ سے اپنی نیک اعمال کے ذریعے سے دعا کرو ان میں سے ایک نے یوں دعا کی اے اللہ میرے دو بوڑھے والدین تھے میں ان سے پہلے کسی کو دودھ نے پلاتا تھا نہ بیوی بچوں کو نہ غلاموں کو ایک دن درخت کی تلاش میں میں دوڑ نکلا گیا اور جب میں رات کو واپس آیا تو وہ سو چکے تھے مجھے یہ پسند نہ ہوا کہ والدین سے پہلے میں اپنے بیوی بچوں اور غلاموں کو پلاؤں تو میں اپنے ہاتھوں میں پیالہ پکڑے ٹھہرا رہا اور ان کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ فجر طلوع ہو گئی اے اللہ اگر میں نے یہ عمل تیری رضا کے لئے کیا ہے تو ہم جس مشکل میں ہیں آپ اس سے ہمیں کشادگی عطا فرمادیں چٹان کچھ سر کی لیکن ابھی نکل نہ سکتے تھے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دوسرے نے دعا کی اے اللہ میری ایک چچا زاد بہن تھی جو لوگوں میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی میں نے اس سے اپنی مردا چاہی لیکن وہ نہ مانی یہاں تک کہ ایک مرتبہ قحط پڑا تو وہ میرے پاس آئی تو میں نے اس کو ایک سو بیس دینار اس شرط پر دیئے کہ وہ میری مراد کے حصول میں حائل نہ ہوگی حتی کہ جب میں نے اس پر

قدرت پالی تو وہ بولی کہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم جائز طریقے کے بغیر مہر کو توڑو۔ اس پر میں اس سے جماع کرنے سے باز رہا اور اس سے پرے ہٹ گیا حالانکہ وہ لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی اور میں نے جو اس کو سونا دیا تھا وہ اس کے پاس چھوڑ دیا اے اللہ اگر میں نے یہ عمل آپ کی رضامندی کیلئے کیا تھا تو ہم جس مشکل میں ہیں اس سے ہم کو رہائی عطا فرما وہ چٹان اپنی جگہ سے کچھ اور ہلی لیکن اب بھی وہ اس سے نکل نہ سکتے تھے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تیسرے نے یوں دعا کی۔ اے اللہ میں نے چند مزدور اجرت پر رکھے اور ان کی اجرت بھی دیدی البتہ ان میں سے ایک نے اپنا حصہ چھوڑا اور چلا گیا اس کی اجرت بار آور ہوئی یہاں تک کہ اس سے بہت سے اموال بن گئے پھر ایک عرصے کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے بندے مجھے میری اجرت دیدے میں نے کہا یہ اونٹ گائے بکریاں اور غلام جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمہاری اجرت ہے اس نے کہا اے اللہ کے بندے میرے ساتھ مذاق نہ کر میں نے جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اس نے وہ سارا مال لیا اور ہنکا کر لے گیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا اے اللہ اگر میں نے یہ آپ کی رضامندی کیلئے کیا تھا تو جس مشکل میں ہم ہیں اس سے کشادگی عطا فرما اس پر چٹان ہٹ گئی اور وہ اس غار میں سے نکل کر چلے گئے۔

اس حدیث میں کتنے واضح الفاظ ہیں کہ انہ لاینجیکم من الصخرۃ الا ان تدعوا اللہ بصالح اعمالکم) تم اس چٹان سے نجات حاصل نہیں کر سکو گے مگر یہ کہ تم اللہ تعالیٰ سے اپنے نیک اعمال کے واسطے سے دعا کرو۔

دعا میں رسول اللہ ﷺ کا واسطہ دینا

1. عن عثمان بن حنیف ان رجلاً ضریر البصر اتى النبى ﷺ فقال ادع الله ان يعافينى فقال ان شئت دعوت وان شئت صبرت فهو خير لك قال فادعه فامرہ ان يتوضاء فيحسن الوضوء ويدعو بهذا الدعاء اللهم ان اسئلك واتوجه اليك بنبيك محمد نبى الرحمة يا نبى الله انى توجّهت بك الى ربى فى حاجتى هذه لتقضى لى اللهم فشفعه فى

عثمان بن حنیف سے روایت ہے کہ ایک نابینا شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا

و عرض کیا کہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو عافیت دے آپ نے فرمایا اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور اگر تم چاہو و صبر کر لو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اس نے عرض کیا کہ دعا ہی کر دیجئے آپ نے اس کو حکم دیا کہ وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت پڑھے اور یہ دعا کرے اے اللہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں اور آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں بوسیہ محمد نبی رحمت کے اے محمد میں آپ کے وسیلہ سے اپنی اس حاجت میں اپنی رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ وہ پوری کی جائے اے اللہ آپ کی شفاعت میرے حق میں قبول کیجئے۔

اس حدیث میں اول تو یہ ذکر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی علیحدہ سے کوئی دعا کی ہو اس لئے دعا کے الفاظ اللهم ان اسئلك واتوجه اليك بنبيك کا ترجمہ یہی بنتا ہے کہ اے اللہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں اور آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں بوسیہ محمد ﷺ نبی رحمت کے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آپ ﷺ نے فرمائی تھی اور اس شخص نے اپنی دعا میں نبی ﷺ کی ذات کو وسیلہ نہیں بنایا بلکہ آپ کی دعا کو وسیلہ بنایا تھا تب بھی دعا میں غیر اللہ یعنی عمل کو وسیلہ بنانا تو ثابت ہوا۔

2. حدثنا ابو الجوزا اوس بن عبد الله قال قحط اهل المدينه قحطا شديدا فشكوا الى عائشه فقالت انظر واقبر النبي ﷺ فاجعلوا منه كوا الى السماء حتى لا يكون بينه وبين السماء سقف قال ففعلوا فمطروا مطرا حتى نبت العشب و سمنت الابل تفتقتا الشحم فسمى عام اليتق (سنن دارمی ص 43 ج 1)

ابو الجوزاء سے روایت ہے کہ مدینہ میں سخت قحط ہوا لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شکایت کی آپ نے فرمایا کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کو دیکھ کر اس کے مقابل آسمان کی طرف اس میں ایک سوراخ کر دو یہاں تک کہ اس کے اور آسمان کے درمیان حجاب اور چھت نہ رہے چنانچہ ایسا ہی کیا تو بہت زور کی بارش ہوئی حتیٰ کہ خوب گھاس آگئی اور اونٹ خوب فرہ ہو گئے اور فرہی کی وجہ سے پھٹے پڑتے تھے اسی وجہ سے اس سال کو عام الفتح یعنی پھٹنے کا سال کہا جاتا ہے۔

اس واقعہ میں آسمان کی طرف حجرہ مبارک کا روشن دان کھولنے کا آخر مطب کیا ہو سکتا ہے؟ بارش تو اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے اور لوگ مانگ بھی رہے ہوں گے پھر یہ عمل کیسا؟ اس کا

مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ نبی ﷺ کی ذات کو وسیلہ بنایا گیا ہے۔

ابو بکر علمنی النبی ﷺ هذا الدعاء فقال قل اللهم انی اسئلك بمحمد نبیک و بابر اہیم خلیلک و بموسیٰ نجیک و عیسیٰ روحک و کلمتک و توراۃ موسیٰ و انجیل عیسیٰ و زبور داؤد و فرقان محمد و کل وحی او حیثہ او قضاء قضیتہ و اسئلك بکل اسم هولک انزلتہ فی کتابک او استاثرت بہ فی غیبک و اسئلك باسمک الطھر الطاهر بالا حد الصمد الوتر و بعظمتک و کبریائک و بنور و جہک ان ترزقنی القرآن و العلم وان تخلط بلحمی و دمی و سمعی و بصری و تستعمل بہ جسدی بحولک و قوتک فانہ لا حول ولا قوۃ الا بک (رزین) (ص 458 جمع الفوائد ج 1)

حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے یہ دعا سکھائی! فرمایا کہو اے اللہ میں آپ کے نبی محمد اور آپ کے خلیل ابراہیم اور آپ کے نبی موسیٰ اور آپ کے روح اور کلمہ عیسیٰ علیہم السلام کے واسطے سے اور موسیٰ علیہ السلام کی تورات اور عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور داؤد علیہ السلام کی زبور اور محمد ﷺ کے فرقان کے واسطے سے اور ہر وحی کے واسطے سے جو آپ نے کی ہو اور ہر فیصلے کے واسطے سے جو آپ نے کیا ہو آپ سے سوال کرتا ہوں۔..... الخ

دعا میں کسی بندے کے حق کا واسطہ دینا

ڈاکٹر عثمانی صاحب اپنے راسلہ میں لکھتے ہیں۔

”ابو الحسن قدوری اپنی فقہ کی کتاب المسمی بشرح الکرنی کے باب الکراہتہ میں لکھتے ہیں: بشر بن ولید کہتے ہیں کہ مجھ سے امام ابو یوسفؒ نے بیان کیا کہ امام ابو حنیفہؒ نے کہا کسی کے لئے اللہ تعالیٰ سے بجز اس کی ذات و صفات کے حوالہ دے کر دعا کرنا جائز نہیں ہے اور میں ناجائز سمجھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ بحق تیری مخلوق کے اور یہی قول ابو یوسفؒ کا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں بھی ناجائز سمجھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ بحق تیرے نبیوں کے یا بحق تیرے رسولوں کے یا بحق بیت الحرام کے یا بحق مشعر الحرام کے اس کے بعد امام قدوری کہتے ہیں کہ خدا سے اس کی مخلوق کا واسطہ دے کر سوال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ کسی مخلوق کا بھی خالق پر کوئی حق نہیں ہے۔“

(وسیلہ کا شرک ص 6)

اس حوالہ اور چند دیگر حوالوں سے ڈاکٹر عثمانی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ بحق فلاں یا بحرمت فلاں کہہ کر دعا مانگنا جائز نہیں ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس مسئلہ میں بھی ڈاکٹر عثمانی صاحب نے نہ تو صحیح حدیثوں کو پیش نظر رکھا اور نہ ہی مذکورہ بالا حوالہ کی حقیقت کو سمجھا اور بلاوجہ یہ الزام لگا دیا کہ اللہ تعالیٰ پر اس کے بندوں کی دھونس کا یہ انداز بھی خوب ہے۔“ (ص 6)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دیگر کتابوں میں یہ حدیث ہے۔

عن معاذ بن جبل قال كنت ردف النبي ﷺ على حمار ليس بيني وبينه الا مؤخرة الرحل فقال يا معاذ تدري ماحق الله على عباده و ماحق العباد على الله قلت الله و رسوله اعلم قال فان حق الله على العباد ان يعبدوه ولا بشر كوابه شيئا و حق العباد على الله ان لا يعذب من لا يشرك به شيئا قلت يا رسول الله افلا ابشر الناس قال تبشرهم فيتكلموا.

حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں ایک گدھے پر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا میرے اور آپ کے درمیان صرف کاٹھی کے کچھلی لکڑی تھی آپ ﷺ نے پوچھا اے معاذ کیا تم جانتے ہو اللہ کا اس کے بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے کہتے ہیں میں نے جواب دیا اللہ اور اس کے رسول ہی خوب باخبر ہیں آپ نے ارشاد فرمایا بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اس کو عذاب نہ دے..... الی آخر الحدیث)

اس صحیح حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر ذکر فرماتے ہیں کہ وہ شرک سے بچنے والوں کو کسی قسم کا عذاب نہ دے گا۔ جب کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب بندوں کے حق کا انکار کرتے ہیں اور اس کو دھونس بتاتے ہیں اور قدوری اور ہدایہ کے حوالوں سے بحق فلاں کے ساتھ دعا کو ناجائز کہتے ہیں حالانکہ صحیح حدیث کے خلاف یہ بات کیونکر قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حق کا لفظ متعدد معنوں میں آتا ہے۔

1- واجب عقلی۔ جو قطعی عقلی دلائل سے ثابت ہو اور اس کا خلاف عقلاً محال ہو۔

2- واجب شرعی۔ جو نص شرعی اور وعدہ خداوندی کی بنا پر ثابت ہو اگرچہ عقلاً اس کا وجود

ضروری نہ ہو۔

3- لائق اور مناسب 4- ثابت شدہ۔ یعنی وہ چیز جو وجود رکھتی ہو اگرچہ ضروری نہ ہو۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں معتزلہ نام کے ایک فرقہ کا بہت زور شور ہوا یہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ پر عدل اور اصلاح عقلاً واجب ہے اس لئے کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر عقلاً واجب ہے کہ وہ اہل توحید کی بخشش کرے اور بندوں کا یہ حق اس پر لازم قرار دیتے تھے ان کے بالمقابل اہلسنت والجماعت اللہ تعالیٰ پر کسی فعل کو عقلاً واجب نہیں مانتے اور جو حق اللہ تعالیٰ نے بندے کے لئے ذکر کیا وہ بھی محض اس کا فضل ہے اس پر واجب نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ تابعین میں سے ہیں جب کہ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ تبع تابعین میں سے ہیں انہوں نے اپنے زمانے میں معتزلہ کے عقائد کو دیکھ کر سد باب کے طور پر بحق فلاں وغیرہ الفاظ کے ساتھ دعا کرنے کو منع فرمایا تاکہ لوگ حق کے واجب عقلی ہونے کا عقیدہ نہ باندھ لیں اب جب کہ معتزلہ اور ان کے عقائد معدوم ہو گئے تو وہ اشتباہ اور اندیشہ بھی ختم ہو گیا اور دوسرے جائز معنی میں بحق فلاں وغیرہ کلمات کا استعمال درست ہوا۔
رد المحتار شرح درمختار میں ہے۔

(قوله لا نه لا حق للخلق على الخالق) قد يقال انه لا حق لهم وجوبا على الله تعالى لكن الله سبحانه وتعالى جعل لهم حقاً من فضله.
قوله کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے کہا جاتا ہے کہ مخلوق کا اللہ تعالیٰ پر کوئی حق وجوباً نہیں ہے..... بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ اس کے عقلاً پابند ہوں..... البتہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی فضل سے مخلوق کے لئے حق بنایا ہے۔

چوتھا: باب

ڈاکٹر عثمانی اور تعویذ کا مسئلہ

ڈاکٹر عثمانی صاحب ”تعویذ لٹکانا شرک ہے“ کے عنوان کے تحت یہ دلائل لائے ہیں۔
پہلی دلیل

عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول ان الرقى و التمايم و التولة شرک۔

عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ دم تعویذ اور تولہ سب شرک ہیں۔
دلیل کا جواب:

تمام کا ترجمہ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے تعویذ کیا ہے۔
ڈاکٹر عثمانی صاحب کا اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔
پہلی وجہ:

تمام جس کا واحد تیمم ہے اس کا اصل معنی منکے کا ہے۔ لسان العرب جو کہ عربی لغت کی سب سے مستند کتابوں میں سے ہے تیمم کا مطلب یہ بتایا ہے۔
خوزة رقطاع تنظم فی السیر ثم یعقد فی العنق۔

سیاہ یا سفید منکا جس کو دھاگے میں پرو کر گردن میں لٹکایا جاتا ہے اور عرب یہ بچوں کی گردنوں میں کیوں لٹکاتے تھے؟
لسان العرب میں ہے کانوا یعقلون انها تمام الدواء والشفاء (ان کا اعتقاد تھا کہ منکے ہی پوری دوا اور شفا ہیں)۔

مرقات میں ہے: كانت العرب تعلق علی الصبی لدفع العین بزعمهم (عربوں کا عقیدہ تھا کہ یہ نظر کو دور کرتے ہیں)۔

لسان العرب میں ہے: لانهم جعلوها واقية من المقادير و الموت و واراو دفع ذلك بها (عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یا منکے ان کی تقدیر الہی اور موت سے بچا سکتے

ہیں اور وہ اس غرض سے ان کا استعمال کرتے تھے۔

غرض تمام سے مراد وہ منکے ہیں جن کو عرب ایام جاہلیت میں اس عقیدے کے ساتھ استعمال کرتے تھے کہ یہ تقدیر الہی اور موت کو ٹال سکتے ہیں اور یہ کہ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ از خود نظر سے بچا سکتے ہیں اور از خود دواء اور شفا کا کام کر سکتے ہیں حالانکہ یہ خدائی کام ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ جاہلیت اور شرک کی رسوم مٹانے آئے تھے لہذا آپ ﷺ نے جب تمام سے منع کیا تو ان منکوں سے منع کیا جن کو ایام جاہلیت میں عرب خدائی کاموں میں ذخیل سمجھتے تھے۔

دوسری وجہ:

جیاس کہ اوپر بتایا گیا کہ تمام کا اصل ترجمہ تو منکے ہیں بعض حضرات نے تعویذ کا معنی بھی کیا ہے مثلاً لسان العرب میں ثعلب سے روایت ہے عوزۃ تعلق علی الانسان (تمیمہ وہ تعویذ ہوتا ہے جو انسان کے گلے میں لٹکایا جاتا ہے)۔

مرقات میں ہے التعویذۃ التي تعلق علی المصبی (یہ وہ تعویذ ہے جو بچے کے گلے میں لٹکایا جاتا ہے) پھر تعویذ کا معنی لینے کی صورت میں عام طور سے وہ تعویذ مراد لئے گئے ہیں جن میں شرکیہ کلمات ہوں اور اگر قرآن پاک کی آیت یا اسمائے الہی لکھے ہوں تو ان کے تمام میں شمار نہیں کیا گیا۔ صرف چند ایک حضرات نے تمام میں ان تعویذات کو بھی شمار کیا ہے جن پر قرآن پاک کی کوئی آیت لکھی ہو جیسا کہ مرقات میں مذکور ہے کہ اطلق الطیسی (طبی نے تعویذ کو مطلق رکھا ہے مقید نہیں کیا) لیکن یہ حضرات بھی قرآنی تعویذات کا حکم شرکیہ تعویذات سے مختلف سمجھتے ہیں قرآنی تعویذات کو جائز سمجھتے ہیں اور شرکیہ کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اہل لغت اور شارحین حدیث کے نزدیک تمام کے معنی میں اختلاف ہے عام طور سے اس سے مراد منکے ہیں جب کہ بعض لوگ تعویذات کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں اختلاف کی صورت میں تعویذات خصوصاً وہ تعویذات جن پر اسماء الہی لکھے ہوں یا آیات قرآنی لکھی ہوں ان کو قطعی طور سے شرک کہنا بڑی نا انصافی کی بات ہے اور خلاف قاعدہ ہے شاید جوش اصلاح میں ڈاکٹر عثمانی صاحب مسلمہ قواعد کو پیش نظر نہ رکھ سکے۔

تیسری وجہ

ڈاکٹر عثمانی صاحب کا دعویٰ ہے کہ ”قرآنی تعویذات بھی جائز نہیں ہیں“۔ لہذا ان کے قول کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے دور میں ایسے تعویذ تو بالکل نہ ہوں گے جو آیات قرآنی یا اسمائے الہی پر مشتمل ہوں کیونکہ جب تک صحابہؓ کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ قرآنی آیات اور اسمائے الہی لکھے تعویذات مفید ہوتے ہیں اور ان کو استعمال نہ کرتے کیونکہ وہ اپنی طرف سے اختراع کرنے والے نہیں تھے لہذا تمام کے نام سے جو کچھ اس وقت معروف و مروج ہوگا وہ منکے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب تمام سے منع کیا تو اس سے وہی منکے مراد ہوں گے جو اس وقت رائج تھے کیونکہ التمام پر جو الف لام ہے وہ عہد کا ہے جس سے معروف و مروج مراد ہوتا ہے اسی طرح اگر تعویذ بھی مراد ہوں گے تو صرف وہ تعویذ جو ایام جاہلیت میں شرکیہ کلمات پر مشتمل ہوتے تھے۔ اس پر اگر کوئی اعتراض کرے کہ تم نے الف لام کو عہد کے لئے کیوں مانا ہے استعراق یعنی تمام تعویذات کے معنی میں کیوں نہیں لیا تو ہمارا جواب یہ ہے کہ رقی اور تمام ان دونوں میں یہ احتمال ہے کہ ان میں سے کچھ شرکیہ ہوں اور کچھ شرکیہ نہ ہوں رقی (جمع رقیہ یعنی دم) کے بارے میں خود ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ ”بعض قسم کے دم جن میں شرکیہ الفاظ نہیں تھے نبی ﷺ نے ان کی رخصت دے دی“۔ لہذا حدیث: ان الرقی و التمام والتولة شرک میں رقی سے بھی کل رقی مراد نہیں ہیں بلکہ صرف دوم مراد ہیں جن میں شرکیہ الفاظ تھے اس طرح تمام سے بھی سب تمام مراد نہیں ہیں بلکہ منکے اور شرکیہ تعویذ مراد ہیں رہے وہ تعویذ جو قرآنی آیات یا اسمائے الہی پر مشتمل ہوں ان کے بارے میں یہ حدیث ساکت ہے۔

دوسری دلیل

قال رسول الله ﷺ من تعلق شيئا وكل اليه

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے کوئی بھی چیز لٹکائی تو وہ اسی چیز کے سپرد کر دیا جائے گا۔

دلیل کا جواب

ہم جواب میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث تو خود بتا رہی ہے کہ کس قسم کی چیز کو لٹکانے پر یہ وعید ہے یہ وعید ایسی چیز کو لٹکانے پر ہے جس کو بالذات موثر اور شافی مانا جاتا ہو اور تقدیر کو از خود ٹلا

سکتی ہو تو کہا گیا کہ اس شخص کو اسی چیز کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ اچھا جب تم اس کو خدائی کام میں ذخیل سمجھتے ہو تو اب تم کو اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی رحمت ہٹا لیتا ہے اور اگر گلے میں لٹکایا ہوا تعویذ قرآنی آیت اور اسمائے الہی پر مشتمل ہو تو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی طرف سپرد کرنا گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کرنا ہے۔

لہذا اس حدیث سے قرآنی اور غیر قرآنی (شرکیہ) تعویذوں کا فرق معلوم ہوا غرض یہ حدیث بھی ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دعویٰ کے خلاف ہے۔

تیسری دلیل

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے یہ حدیث نقل کی ہے۔

عقبہ بن عامر الجعفی روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس ایک جماعت آئی نبی ﷺ نے ان میں سے نو سے بیعت لے لی اور ایک کو چھوڑ دیا لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ نے نو سے بیعت لے لی اور ایک کو چھوڑ دیا ارشاد فرمایا ان علیہ تمیمہ (کیونکہ وہ تمیمہ لٹکائے ہوئے ہے) یہ سن کر ان صاحب نے ہاتھ اندر ڈال کر وہ تمیمہ توڑ ڈالا اب نبی ﷺ نے ان سے بھی بیعت لے لی اور فرمایا من تعلق تمیمہ فقد اشرك (جس شخص نے تمیمہ لٹکایا اس نے شرک کیا)۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اس حدیث میں ہر جگہ تمیمہ کا ترجمہ تعویذ کیا ہے۔

یہ حدیث ذکر کر کے ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”کیا یہ حدیث یہ نہیں بتاتی کہ ہر قسم کا تعویذ ناجائز ہے ورنہ نبی ﷺ کم سے کم یہ تو ضرور دریافت فرما لیتے کہ یہ تعویذ جو تم نے لٹکایا ہے اس میں قرآن تو نہیں لکھا ہوا ہے اسماء الہی تو نہیں.....“ (ص 4 تعویذ گنڈا شرک ہے)

دلیل کا جواب

نبی ﷺ کے پات آکر جو جماعتیں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتی تھیں وہ بیت اسلام کرتی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں یا مسلمان ہونے آئے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ابھی تک جاہلیت کے رسوم سے پورے طور سے آزاد نہیں ہوئے تھے ان کو تعلیم کی ضرورت تھی لہذا یہ قطعی بات ہے کہ وہ صاحب جاہلیت کے دور کا کوئی منکا لٹکائے ہوئے

ہوں گے اور ان سے نبی ﷺ کا دریافت نہ فرمانا اسی بناء پر تھا کہ آپ ﷺ کو علم تھا کہ یہ جاہلیت کا منکال لٹکائے ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر عثمانی صاحب کا تمیمہ کا ترجمہ تعویذ سے کرنا بھی بلا دلیل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب کے ذکر کردہ دلائل سے قرآنی تعویذات کی حرمت اور ان کا شرک ہونا ثابت نہیں ہوتا ویسے بھی سوچنے کی بات ہے کہ قرآنی آیت یا اسم الہی لکھنا شرک نہیں ہے قرآنی آیات کے کتبے لکھ کر دیوار پر لگانا شرک نہیں ہے تو محض کسی شخص یا بچے کے گلے میں قرآنی آیات یا اسم الہی لکھ کر لٹکانا شرک بن جائے گا؟ یہ بات ناقابل فہم ہے یہ کیسے شرک بن سکتا ہے جب کہ شرک کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک ماننا اور قرآنی آیت یا اسم الہی میں تو اللہ تعالیٰ ہی کو شافی اور متصرف سمجھ کر اسی کا نام لکھ کر اور گلے میں لٹکا کر اسی سے شفا اور دفع تکلیف مطلوب ہے آخر کوئی سمجھائے تو سہی کہ اس پر شرک کی تعریف کیسے صادق آتی ہے؟ فیالجب

قرآنی آیات اور اسمائے الہی پر مشتمل تعویذات کی اجازت کے دلائل

عن محمد بن اسحاق عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله ﷺ كان يعلمهم من الفزع كلمات اعوذ بكلمات الله التامة من غضبه و شر عبادته و من همزات الشياطين و ان يحضرون و كان عبد الله بن عمرو و يعلمهن من عقل من بنيه و من لم يعقل كتبه فاعلقه عليه رواه ابو دائود و في رواية الترمذی و من لم يبلغ منهم كتبها في صك ثم علقها في عنقه (رواه ابو دائود و الترمذی مشكوة)

محمد بن اسحاق عمرو بن شعيب سے اور وہ اپنے والد شعيب سے اور وہ اپنے دادا عبد اللہ بن عمرو سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خوف کے لئے یہ دعا سکھاتے تھے۔ اعوذ بکلمات اللہ التامہ من غضبه و شر عبادته و من همزات الشياطين و ان يحضرون اور عبد اللہ بن عمرؓ اپنے سمجھدار بچوں کو یہ دعا یاد کرواتے تھے اور نا سمجھ بچوں کے گلے میں لکھ کر لٹکا دیا کرتے تھے۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب کے اعتراضات اور ان کے جواب

پہلا اعتراض

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں ”یہ پورے سرمایہ روایت میں اپنے طرز کی ایک منفرد روایت ہے اور صحیح ہونا تو دور رہا یہ حسن روایت بھی نہیں ہے امام ترمذیؒ جو صحیح روایت کے بارے میں بہت ہی فراخ دل واقع ہوئے ہیں اس روایت کو حسن بھی شمار نہیں کرتے بلکہ حسن غریب کہتے ہیں“ (ص 5 تعویذ گنڈاشرک ہے)

جواب

وہ حدیث و روایت جو حسن ہو وہ سب محدثین اور فقہاء کے نزدیک مقبول ہوتی ہے اور اس سے احکام ثابت ہوتے ہیں امام ترمذیؒ نے اس کو حسن کے ساتھ ساتھ جو غریب کہا ہے تو اس وجہ سے کہ یہ روایت صرف اسی ایک طریقے سے وارد ہوئی ہے اور صرف ایک طریقے سے وارد ہونا اس میں ضعف کی تو کوئی بھی وجہ نہیں ہے اس لئے صحیح حدیث بھی غریب ہو سکتی ہے۔

اس پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب اطل میں حسن کی تعریف میں اس شرط کو شامل کیا ہے کہ وہ متعدد طریق سے وارد ہو جب کہ غریب کی تم یہ تعریف کرتے ہو کہ وہ صرف ایک طریق سے وارد ہوتی ہے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں۔

وما ذکرنا فی هذا الكتاب حدیث حسن فانما اردنا حسن اسنادہ عندنا کل حدیث یروی لایکون فی اسنادہ من یتهم بالکذب ولا یکون الحدیث شاذاً ویروی من غیر وجه نحو ذلک فهو عندنا حدیث حسن۔

ہم نے اس کتاب میں جو لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ حدیث اسناد کے اعتبار سے حسن ہے ہمارے نزدیک جو حدیث بھی ایسی روایت کی گئی ہو جس کی اسناد میں کوئی ایسا شخص نہ ہو جو جھوٹ کے ساتھ متہم ہو اور وہ حدیث شاذ بھی نہ ہو اور کئی طریق سے روایت کی گئی ہو تو اس قسم کی حدیث ہمارے نزدیک حسن ہے۔

اس اعتراض کا جواب علامہ ابن حجر عسقلانی نے یہ دیا ہے۔

ان الترمذی لم یعرف الحسن مطلقاً و انما عرف بنوع خاص منه وقع فی

کتابہ و هو ما یقول فیہ حسن من غیر صفة

امام ترمذی نے مطلق حسن کی تعریف نہیں کی بلکہ حسن کی ایک خاص قسم کی تعریف کی ہے اور یہ وہ قسم ہے جس کے ساتھ انہوں نے کوئی اور صفت ذکر نہیں کی۔

غرض یہ تعریف امام ترمذی نے اپنی اصطلاح کے مطابق اس روایت کی کی ہے جس کو وہ ”حدیث حسن“ کہتے ہیں اور جس کو وہ حسن صحیح یا حسن غریب کہتے ہیں تو اس کی تعریف انہوں نے نہیں کی بلکہ اس میں انہوں نے حسن کی مشہور تعریف ہی پر اکتفا کیا ہے اور حسن کی مشہور تعریف میں روایت کا متعدد طریقوں سے وارد ہونا شرط نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں ”دوسری علت اس روایت میں یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے متعلق یہ جملہ کہ وہ اس دعا کو نابالغ بچوں کے گلے میں لکھ کر لٹکا دیا کرتے تھے حدیث کے الفاظ نہیں بلکہ راوی کی طرف سے یہ ایک مدرج جملہ ہے“۔

جواب

ڈاکٹر عثمانی صاحب کا اس کو علت اور مدرج کہنا بہت ہی تعجب کی بات ہے کیونکہ یہ کسی اعتبار سے بھی مدرج نہیں ہے۔

تقریب میں مدرج کی یوں تعریف کی ہے۔

المدرج هو اقسام

احدها مدرج فی حدیث النبی ﷺ بان یذکر الراوی عقیبہ کلاما لنفسہ او لغيرہ فیروہ من بعدہ متصلا فیوہم انه من الحدیث۔
مدرج کی چند قسمیں ہیں۔

پہلی قسم حدیث نبوی میں مدرج اس کی صورت یہ ہے کہ حدیث نبوی کے متصلا بعد اپنا کسی دوسرے کا کلام ذکر کرے کہ یہ خیال ہو کہ وہ بھی حدیث نبوی کا حصہ ہے۔
الثانی ان یکون عندہ متنان با سنادین فیروہما با حدہما۔

دوسری قسم یہ ہے کہ ایک راوی کے پاس دو مختلف سندوں سے دو مختلف حدیثیں ہوں اور وہ راوی ان دونوں حدیثوں کو صرف ایک سند سے ذکر کرے۔

آپ یہ پوری حدیث پڑھ جائیے یہ خیال اور وہم بالکل پیدا نہ ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن

عمرؓ کے عمل کا بیان بھی نبی ﷺ کے فرمان و ارشاد کا حصہ ہے بلکہ نبی ﷺ کا ارشاد اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل کا بیان یہ دو جدا جدا باتیں ہیں لہذا یہ مدرج کی پہلی قسم نہیں بنتی۔ اور اگرچہ یہ دو حدیثیں بنتی ہیں لیکن ان کی سندیں مختلف نہیں ہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے عمل کو ذکر کرنے والے یا تو شعیب ہیں یا عمرو بن شعیب ہیں اور ان میں سے جو بھی بیان کرنے والا ہو وہ بہر حال ثقہ ہے جھوٹا نہیں ہے لہذا نہ تو یہ مدرج ہے اور نہ ہی کسی طرح سے یہ علت بنتی ہے کہ جو ضعف کا سبب ہو۔

تیسرا اعتراض

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک صحابیؓ کسی چیز کی برائی کی حدیث بھی روایت کرے اور دوسری طرف اس چیز میں مبتلا بھی ہو روایت یوں ہے عن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول ما ابالی ما اتیت ان انا شربت تر یا قالو تعلقتم تمیمہ او قلت الشعر من قبل نفیسی (رواہ ابوداؤد ص 540 مشکوٰۃ ص 389)

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر میں یہ تین باتیں کروں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب مجھے حق و ناحق کی کوئی پراہ نہیں ہے وہ تین باتیں یہ ہیں (1) تریاق استعمال کروں (اس میں شراب اور سانپوں کا گوشت ہوتا ہے) (2) تعویذ لکھاؤں (3) شاعری کروں (تعویذ گندہ شرک ہے ص 6)

جواب

اس بارے میں ہم تفصیل سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تمیمہ کا اصل معنی منکے کا ہے اور تعویذ بھی اس میں شامل ہیں تو صرف شرکیہ تعویذ ہیں یہ تو ثابت نہیں ہے کہ قرآنی آیات اور اسمائے الہی پر مشتمل تعویذ بھی تمیمہ میں شامل ہیں بلکہ دلائل اس کے خلاف ہیں جیسا کہ پیچھے مدلل بیان ہو چکا۔

چوتھا اعتراض

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں ”چوتھی علت اس روایت میں یہ ہے کہ اس کے دو راوی محمد بن اسحاق بن یسار اور عمرو بن شعیب ایسے راوی ہیں جن پر ائمہ حدیث نے شدید جرح کی

ہے۔

محمد بن اسحاق بن یسار

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے ان کے بارے میں جو تحقیق و تفتیش ذکر کی ہے وہ اس اعتبار سے بہت ہی نا انصافی اور ظلم پر مشتمل ہے کہ اول تو وہ یکطرفہ ہے دوسرے الزامات کی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ ان ہی دونوں باتوں پر کسی راوی کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کی حدیث لی جائے گی یا نہیں۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے محمد بن اسحاق کے بارے میں نقل کیا ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں دجال من الدجاجلہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے۔ سلیمان نبی کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے۔ یحییٰ قطان کہتے ہیں کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ کذاب (بہت بڑا جھوٹا) ہے۔ وہیب بن خالد اس کو کاذب کہتے ہیں۔ جریر بن عبد الحمید کا بیان ہے کہ میرا یہ خیال نہ تھا کہ میں اس زمانہ تک زندہ رہوں گا جب لوگ محمد بن اسحاق سے حدیث کی سماعت کریں گے۔ (ص 6 تعویذ گنڈاشرک ہے) ہم پہلے ان الزامات کی حقیقت نقل کرتے ہیں پھر محمد بن اسحاق کے ثقہ ہونے کو ذکر کریں گے۔

امام مالک کا محمد بن اسحاق کو دجال کہنے کی حقیقت

اما مالک فانہ کان ذلک منہ مرة واحدة ثم عادله الی ما یحب و ذلک بانہ لم یکن فی الحجاز احمد اعلم بانساب الناس و ایامہم من ابن اسحاق و کان یزعم ان مالک من موالی ذی اصبح و کان مالک یزعم انہ من انفسہا فوقع بینہما لذلک منافرة فلما صنف مالک الموطا قال ابن اسحق ائتونی فانا بیطارہ فنقل ذلک الی مالک فقال هذا دجال من الدجاجلہ یروی عن الیہود و کان بینہما ما یکون بین الناس حتی عزم ابن اسحاق الخروج الی العراق فتصالحا حینذ و اعطاه مالک عند الوداع خمسین دینار او نصف ثمرتہ لتلک النسۃ و لم یقدح فیہ مالک لاجل الحدیث انما کان ینکر علیہ لتبعہ غزوات النبی ﷺ من اولاد الیہود الذین واسلمو او حفظوا قصۃ خیر و قریظۃ

و النضير و ما اشبه ذلك من الغرائب عن اسلافهم و كان ابن اسحاق تتبع هذا عنهم ليعلم ذلك من غير ان يحتج بهم و كان مالک لا يرى الرواية الا من متقن صدوق (ص 189 حاثيته الرفع والتكميل فى الحبرج و القعدیل)

امام مالک نے محمد بن اسحاق کے بارے میں دجال کا قول صرف ایک مرتبہ کیا پھر دوبارہ پسندیدہ بات کی طرف لوٹ آئے بات یہ ہوئی تھی کہ حجاز میں لوگوں کے انساب اور واقعات کا محمد بن اسحاق سے زیادہ کوئی باخبر نہ تھا ابن اسحاق کا دعویٰ تھا کہ امام مالک قبیلہ ذوالصبح کے موالیٰ میں سے ہیں جب کہ امام مالک اپنے آپ کو قبیلہ کے اصل افراد میں شمار کرتے تھے اس وجہ سے ان کے درمیان کچھ منافرت پیدا ہوئی تو جب امام مالک نے اپنی موطا لکھی تو ابن اسحاق نے کہا کہ موطا میرے پاس لاؤ میں اس کا معالج ہوں امام مالک کو کسی نے یہ بات بتائی تو انہوں نے کہا وہ تو دجالوں میں سے ایک دجال ہیں اور یہود سے روایت کرتے ہیں تو لوگوں کے درمیان جو رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں اسی طرح کی رنجش ان کے درمیان تھی لیکن جب ابن اسحاق کا عراق جانے کا ارادہ ہوا تو دونوں کے درمیان صلح ہو گئی اور امام مالک نے ہدیہ میں ان کو پچاس دینار اور ایک سال کی نصف پیداوار ان کو ہدیہ میں دی غرض امام مالک نے حدیث کی وجہ سے محمد بن اسحاق پر کوئی طعن نہیں کیا تھا علاوہ ازیں محمد بن اسحاق مسلمان ہونے والے یہودیوں کی اولاد سے خیر، قریظہ اور بنو نضیر کے واقعات سن کر قلمبند کرتے ایسا وہ صرف معلومات کی خاطر کرتے تھے بطور حجت کے نہیں لیتے تھے امام مالک کو ان سے اس بارے میں اتفاق نہیں تھا اور ان کا کہنا تھا روایت صرف پختہ اور سچے شخص ہی سے کرنی چاہئے۔

دیکھیے امام مالک کا محمد بن اسحاق پر اعتراض حدیث کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ محض باہمی رنجش جو انسان ہونے کے ناطے ان کے درمیان پیدا ہوئی اس کی وجہ سے ایک بات کہی پھر بعد میں وہ رنجش ختم بھی ہو گئی ایسی بات کو اصول حدیث میں راوی پر طعن شمار نہیں کیا جاتا۔

ہشام بن عروہ اور دوسروں کا محمد بن اسحاق کو کذاب کہنے کی حقیقت

سليمان بن دائود قال قال يحيى القطان اشهدان محمد بن اسحاق كذاب قلت و ما يدريك قال قال لي وهيب فقلت لو هيب و ما يدريك قال قال لي مالک بن انس فقلت لمالک و ما يدريك قال قال لي بشام بن عروة قال

قلت لهشام بن عروة و ما يدري قال حدث عن امراتي فاطمه بنت المنذر و ادخلت على وهى بنت تسع و مار آهار جل قط حتى لقيت الله تعالى قلت قد اجينا عن هذا والرجل فما قال انه رآها فبمثل هذا يعتمد على تكذيب رجل من اهل العلم هذا مردود.

ثم ما قيل من انها ادخلت عليه وهى بنت تسع غلط بين ما ادري ممن وقع من رواية الحكايه فانها اكبر من هشام بثلاث عشرة سنة ولعلها مازفت اليه الا وقد قاربت بضعاو عشرين سنة و اخذ عنها ابن اسحق وهى بنت بضع و خمسين سنة او اكثر. ميزان الاعتدال ص 471/3

قلت و ما يدري هشام بن عروة فلعله سمع منها فى المسجد او سمع منها وهو صبي او دخل عليها فحدثته من وراء حجاب فإى شئى فى هذا و قد كانت امراة قد كبرت و استت. (ميزان الاعتدال ص 470/3)

سليمان بن داؤد کہتے ہیں کہ یحییٰ قطان نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد بن اسحاق کذاب ہیں میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے علم ہوا انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے وہیب نے یہ کہا میں نے پھر وہیب سے پوچھا کہ آپ کو کیسے علم ہوا انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے وہیب نے یہ کہا میں نے پھر وہیب سے پوچھا کہ آپ کو کیسے علم ہوا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے هشام بن عروہ نے کہا پھر جب میں هشام بن عروہ سے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا تو انہوں نے جواب دیا کہ محمد بن اسحاق نے میری بیو فاطمہ بنت منذر سے حدیث روایت کی حالانکہ میری طرف اس کی رخصتی نو سال کی عمر میں ہوئی اس وقت سے اس کی موت تک کسی مرد نے اس کو نہیں دیکھا۔

علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ اس کا جواب ہم دے چکے ہیں (جو آگے آ رہا ہے) کیا ایسی بات کو بنیاد بنا کر ایک اہل علم شخص کی تکذیب کی جاتی ہے یہ بات تو قابل رد ہے اور یہ جو کہا گیا کہ فاطمہ بنت منذر کی نو سال کی عمر میں هشام کی طرف رخصتی کی گئی تو یہ کھلی غلطی ہے میں نہیں جانتا کہ راویوں میں سے کس نے یہ بات کہی کیونکہ فاطمہ ہشام سے تیرہ سال بڑی تھیں اس لئے خیال تو یہ ہے کہ جب ان کی رخصتی ہوئی ہوگی تو وہ اٹھائیس انتیس سال کی ہوں گی اور ابن

اسحاق نے ان سے اس وقت حدیث سنی ہوگی جب وہ پچاس سے اوپر کی ہوں گی۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں ہشام بن عروہ ان کو کذاب کیسے کہتے ہیں حالانکہ ہو سکتا ہے کہ محمد بن اسحاق نے فاطمہ سے مسجد میں حدیث سنی ہو یا اپنے بچپن میں ان سے حدیث سنی ہو یا ان کے پاس بھی گئے ہوں تو پردے کے پیچھے سے انہوں نے حدیث بیان کی ہو اور جب کہ عورت بوڑھی اور عمر رسیدہ ہو تو اس میں کون سے طعن کی بات ہے۔

دیکھئے محدثین نے جہاں کہے ہوئے اقوال نقل کئے وہیں انہوں نے تحقیق و جستجو کر کے ان کی حقیقت بھی واضح کر دی اور بتا دیا کہ یہ اقوال ایسے نہیں کہ ان کی بناء پر ایک اہل کو جھوٹا اور مطعون مان لیا جائے۔

اب آگے ہم محمد بن اسحاق کی توثیق نقل کرتے ہیں

عن علی بن المدنی عن ابن عیینہ قال جالست ابن اسحاق منذ بضع و سبعین سنہ و ما یتھمہ احد من اهل المدینہ ولا یقول فیہ شیئا۔

علی بن مدینی روایت کرتے ہیں سفیان بن عیینہ نے کہا کہ میں نے ہتر سالوں سے ابن اسحاق کے ساتھ ہم نشینی کی ہے اہل مدینہ میں سے کوئی نہیں ہے جو ان پر تہمت لگاتا ہو یا ان کے بارے میں کوئی طعن کرتا ہو۔

عن احمد ہو حسن الحدیث

احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق حدیث میں اچھے ہیں۔

قال ابو زرعه الدمشقی و ابن اسحاق رجل قد اجمع الکبراء من اهل العلم علی الاخذ عنه و قد اختبره اهل الحدیث فراوا صدقا و خیرا مع مدحه ابن شہاب لہ۔

ابو زرعه دمشقی کہتے ہیں کہ بڑے بڑے اہل علم کا محمد بن اسحاق سے حدیث لینے پر اتفاق ہے محدثین نے ان کو پرکھا ہے اور ان میں سچائی اور خیر کو پایا ابن شہاب زہری نے جو ان کی مدح کی ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

قال یعقوب سالت ابن المدینی کیف حدیث ابن اسحاق عندک فقال

صحیح۔

یعقوب کہتے ہیں کہ میں علی بن مدینی سے پوچھا کہ محمد بن اسحاق کی حدیث کیسی ہے انہوں نے جواب دیا صحیح ہے۔

عن ابن معین محمد بن اسحاق ثقہ و ليس بحجة قال العجلي مدني ثقة .
یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق ثقہ ہیں اگرچہ حجت نہیں ہے عجل کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق ثقہ ہیں۔

قال ابن عيينه سمعت شعبه يقول محمد بن اسحاق امير المؤمنين في الحديث .

سفیان بن عینہ کہتے ہیں کہ میں نے شعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا محمد بن اسحاق حدیث میں امیر المؤمنین ہیں۔

اور اگر ہم محمد بن اسحاق پر کی گئی جرح کو تسلیم بھی کر لیں تب بھی یہ بات سامنے آئی کہ ان کی جرح بھی کی گئی اور ان کی توثیق بھی کی گئی ہے اور ایسے کے بارے میں۔

قال المنذرى فى مقدمة ترغيب فاقول اذا كان رواة اسناد الحديث ثقات و فيهم من اختلف فيه اسناده حسن او مستقيم اولا باس به .

علامہ منذری اپنی کتاب الترغیب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جب حدیث کی سند میں راوی ثقہ ہوں البتہ کچھ ایسے ہوں جن کے بارے میں اختلاف ہوا ہو تو اس حدیث کی سند حسن یا مستقیم ہوتی ہے اور اس میں کچھ حرج نہیں ہوتا۔

اور پھر علامہ منذریؒ محمد بن اسحاق کے بارے میں فیصلہ دیتے ہیں۔

وبالجملة فهو من اختلف فيه و هو حسن الحديث . محمد بن اسحاق ان راویوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور ان کی حدیث حسن ہے۔

عمرو بن شعيب

ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”ان کا معاملہ بھی اپنے شاگرد سے مختلف نہیں ہے ابوداؤد کہتے ہیں کہ عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ليس بحجة (یعنی) عمرو بن شعيب کی روایت اپنے باپ سے اور ان کی اپنے دادا سے حجت نہیں ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ وہ آدمی حجت بھی نہیں ہے یحییٰ بن

سعید کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب ہمارے نزدیک واہی ہے امام احمد کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کی روایت حجت نہیں ہے ابو زرہ کہتے ہیں کہ عمرو نے اپنے باپ سے صرف چند روایتیں سنی ہیں لیکن وہ باپ اور دادا سے منسوب کر کے تمام غیر مسموع روایتیں بے تحاشا بیان کرتے ہیں ابن حجر کہتے ہیں کہ انہوں نے عن ابیہ عن جدہ کے طریقہ سے کچھ بھی نہیں سنا وہ کتاب سے نقل کر کے محض تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ (ص 6 تعویذ گنڈا شرک ہے)۔

اس بارے میں وضاحت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے نبی ﷺ کے ارشادات سننے کے ساتھ لکھنے کا کام بھی کیا تھا جس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہو گئی تھی جس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا تھا یہ کتاب انہیں اس قدر عزیز تھی کہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

ما یرغبنی فی الحیوة الا الصادقة و الوھط مجھے زندگی کی یہی دو چیزیں خواہش دلاتی ہیں صادقہ اور وھط۔

اور خود ہی ان دو چیزوں کا تعارف یوں کرایا۔

فاما الصادقة فصحیفة کتبتھا من رسول اللہ ﷺ و اما الوھط فارض تصدق بہا عمرو بن العاص کان یقوم علیہا۔

صادقہ تو وہ صحیفہ ہے جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھا ہے اور وھط وہ زمین ہے جس کو حضرت عمرو بن العاص نے راہ خدا میں وقف کیا تھا اور وہ اس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

یہ کتاب اور صحیفہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی وفات پر ان کے پوتے شعیب بن محمد بن عبداللہ کو ملا تھا اور شعیب سے اس صحیفہ کو ان کے صاحبزادے عمرو روایت کرتے ہیں حنانچہ حدیث کی کتابوں میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے جتنی بھی روایتیں منقول ہیں وہ سب صحیفہ صادقہ ہی کی حدیثیں ہیں شعیب کے والد کا انتقال شروع ہی میں اپنے والد عبداللہ بن عمرو کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اس لئے پوتے کی تمام تر تربیت دادا ہی نے کی البتہ محدثین کا اس میں اختلاف ہے کہ شعیب نے صادقہ کا یہ نسخہ دادا سے پڑھ لیا نہیں بعض سخت گیر محدثین نے اسی بناء پر ان روایات کے اتصال پر بھی کلام کیا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب میں یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں۔

هو ثقة في نفسه و ماروى عن ابيه عن جده لا حجة في و ليس بمتصل و هو ضعيف من قبيل انه مرسل و جد شعيب كتب عبدالله بن عمرو فكان يروها عن جده لرسالا و هي صحاح عن عبدالله بن عمرو و غير انه لم يسمعها.

یہ خود توثیق ہیں اور جو روایت یہ اپنے باپ شعیب سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمروؓ سے کرتے ہیں وہ حجت نہیں غیر متصل ہے اور بسبب مرسل ہونے کے ضعیف ہے شعیب کو عبداللہ بن عمروؓ کی کتابیں ملی تھیں چنانچہ وہ ان کو اپنے دادا سے مرسل روایت کرتے ہیں یہ روایتیں اگرچہ عبداللہ بن عمروؓ سے صحیح ہیں لیکن ان کو شعیب نے سنا نہیں تھا۔
حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے جواب میں فرماتے ہیں۔

قلت فاذا شهد له ابن معين ان احاديثه صحاح غير انه لم يسمعها و صح سماعه لبعضها فغاية الباقي ان يكون وجادة صحيحة و هو احد وجوه التحمل .
میں کہتا ہوں جب کہ ابن معین اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس کی حدیثیں تو صحیح ہیں مگر ان کو شعیب نے سنا نہیں ہے اور بعض حدیثوں کا سماع صحت کو پہنچ چکا ہے تو بقیہ احادیث کی روایت زیادہ سے زیادہ وجادہ صحیحہ سے ہوگی اور یہ بھی اخذ علم کا ایک طریقہ ہے۔ اور امام ترمذی اپنی جامع میں فرماتے ہیں۔

ومن تكلم في حديث عمرو بن شعيب انما ضعفه لانه يحدث عن صحيفة جده كانهم راوا انه لم يسمع هذا الاحاديث من جده اور جس نے بھی عمرو بن شعیب کی حدیث میں کلام کیا ہے سو محض اس بنا پر اس کی ضعیف کی ہے کہ وہ اپنے دادا کے صحیفہ سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے گویا ان لوگوں کی یہ رائے ہے کہ انہوں نے ان حدیثوں کو اپنے دادا سے نہیں سنا تھا۔

لیکن اکثر محدثین عمرو بن شعیب کی ان حدیثوں کو حجت مانتے اور صحیح سمجھتے ہیں چنانچہ امام ترمذی اسی عبارت سے ذرا پہلے امام بخاری سے ناقل ہیں کہ

رايت احمد و اسحاق و ذكر غير هما يحتجون بحديث عمرو بن شعيب میں نے احمد بن حنبل اسحاق بن راہویہ اور ان دونوں کے علاوہ اور محدثین کا بھی ذکر کیا کہ ان سب کو دیکھا کہ وہ عمرو بن شعیب کی حدیث کو حجت مانتے تھے۔

اور باب ماجاء فی زکوٰۃ مال الیتیم میں لکھتے ہیں۔

واما اکثر اہل الحدیث فیحبون بحديث عمرو بن شعيب و يشبتونه اور اکثر محدثین عمرو بن شعیب کی حدیث کو حجت سمجھتے اور ثابت مانتے ہیں۔

امام بخاری اور امام ترمذی نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ شعیب نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے حدیثیں سنی ہیں۔

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ جو لوگ عمرو بن شعیب کو ضعیف کہتے ہیں یہ انکا تشدد ہے اور کسی بھی طریقے سے ان کی روایت ضعیف نہیں ہے اسی وجہ سے امام حاکمؒ نے اپنی کتاب المدخل فی علوم الحدیث میں حدیث صحیح کی دس قسمیں کیں جن میں سے پانچ پر سب کا اتفاق ہے اور پانچ میں محدثین کا اختلاف ہے اور جن پانچ میں سب کا اتفاق ہے ان میں پانچویں قسم میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت کو شمار کیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس حدیث پر ڈاکٹر عثمانی کے کئے ہوئے تمام اعتراضات بے بنیاد اور نا انصافی پر مبنی ثابت ہوئے اور یہ حدیث بلاشبہ حسن ہے جو کہ مقبول اور قابل عمل ہوتی ہے۔

قرآنی آیات یا اسماء الہی پر مشتمل تعویذات کے جواز میں تابعین کے فتاویٰ

اگرچہ ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ ”کسی صحابیؓ کسی تابعیؓ نے تمیمہ کو جائز قرار نہیں دیا“ لیکن ہمیں اوپر مندرج حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے عمل کے علاوہ بعض تابعین کا عمل اور فتویٰ بھی جواز میں ملتا ہے مندرجہ ذیل حوالہ جات مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الطب سے لئے گئے ہیں۔

1- ابو عصمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن مسیبؓ سے تعویذ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا ”لا باس اذا کان فی ادیم“ یعنی جب وہ چمڑے میں ہو تو کچھ حرج نہیں ہے۔

2- حضرت جعفر صادقؓ اپنے والد حضرت امام محمد باقرؓ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ”انہ کان لا یری باسا ان یکتب القرآن فی ادیم ثم یعلقه“ وہ قرآنی آیت کو چمڑے پر لکھنے اور گلے میں لٹکانے میں کچھ حرج خیال نہیں کرتے تھے۔

3- حضرت محمد بن سیرینؒ کے بارے میں ہے ”انہ کان لایری باسا بالشئی من القرآن“ وہ قرآنی تعویذ میں کچھ حرج نہ سمجھتے تھے۔

4- عطاء بن ابی رباحؒ کا فتویٰ تھا کہ ”لاباس ان یعلق القرآن“ قرآنی تعویذ لٹکانے میں کچھ حرج نہیں ہے۔

5- ضحاکؒ کے بارے میں ہے ”لم یکن یری باسا ان یعلق الرجل الشئی من کتاب اللہ اذا وضعہ عند الغسل و عند الغائط“ وہ قرآنی تعویذ کو گلے میں لٹکانے میں کچھ حرج خیال نہ کرتے تھے البتہ غسل اور قضائے حاجت کے وقت آدمی اس کو اتار دے۔

ایک اشکال

اب ہماری بات پر صرف ایک اشکال رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا قول ہے جیسا کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے نقل کیا ہے۔ کانو یکرہون التمام کلہا من القرآن و غیر القرآن صحابہ سارے تعویذوں کو مکروہ سمجھتے تھے یعنی ناپسند کرتے تھے خواہ قرآن کے ہوں یا غیر قرآن کے۔ اور صحابہؓ کا مکروہ سمجھنا اس وجہ سے ہوگا کہ وہ ناجائز ہیں۔

اشکال کا حل

یہ ہے کہ کانوا یکرہون کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ صحابہ ناپسند کرتے تھے مگر وہ لفظ استعمال نہیں ہوا یعنی کراہت کی نسبت تعویذوں کی طرف نہیں کی گئی کہ یہ کہہ سکیں کہ تعویذ مکروہ ناجائز ہیں اور کراہت تحریمی ہے بلکہ کراہت کی نسبت صحابہؓ کی طرف ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ناپسند کرتے تھے۔

اب ناپسند کس وجہ سے کرتے تھے؟ کیا اس وجہ سے کرتے تھے کہ تعویذوں کا استعمال ناجائز و حرام ہے؟

اس وجہ کو اختیار کرنا تو صحیح نہیں کیونکہ قرآنی آیات اور اسمائے الہی پر مشتمل تعویذوں کی حرمت پر تو سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر تفصیل گزری جواز کی دلیل البتہ موجود ہے۔ کوئی یہ خیال کرے کہ جب تمام تعویذوں کو ناپسند کرتے تھے خواہ وہ قرآن کے ہوں یا غیر قرآن کے تو جیسے شرکیہ تعویذ کو ناپسند کرنے کی وجہ ان کی حرمت ہے اسی طرح قرآنی تعویذ میں بھی وجہ حرمت ہی ہوگی کیونکہ دونوں کو اکٹھا ذکر کیا ہے۔

جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ خیال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ من القرآن و غیر القرآن سے شرکیہ تعویذ مراد لینا غلط ہے بلکہ مراد ہے کہ صحابہ تمام تعویذوں کو ناپسند کرتے تھے خواہ وہ قرآن سے ہوں یعنی ان پر قرآنی آیت لکھی ہو یا غیر قرآن سے ہوں یعنی ان پر اسمائے الہی وغیرہ لکھے ہوں اور عام طور سے ان کے ناپسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

یدخل الجنة من امتی سبعون الفا بغیر حساب قالوا من هم یا رسول الله قال هم الذین لا یسترقون ولا یتطیرون ولا یکتون و علی ربهم یتوکلون (صحیح مسلم ج 1 ص 116)

میری امت میں سے ستر ہزار..... (مراد ہے کثیر تعداد) افراد جنت میں بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں فرمایا جو نہ دم کرواتے ہیں اور نہ فال لیتے ہیں اور نہ داغ لگواتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

امام خطابؒ فرماتے ہیں المراد من ترکھا توکلا علی اللہ تعالیٰ و رضا بقضائہ و بلائہ۔ (مراد وہ لوگ ہیں جو محض اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اور اس کی قضاء و آزمائش پر راضی ہو کر ان چیزوں کو ترک کرتے ہیں حالانکہ علاج کے یہ تمام طریقے نبی ﷺ اور بعض صحابہ سے ثابت بھی ہیں) اور ہذہ من ارفع درجات المحققین بالا یمان (یہ پکے ایمان والوں کا سب سے بلند درجہ ہے)۔

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں۔

وحاصله ان هؤلاء کمل تفویضهم الی اللہ عزوجل فلم یتسویا فی دفع ما وقعہ بہم ولا شک فی فضیلة هذا الحالة و رجحان صاحبها و اما تطبب النبی ﷺ ففعله لیبین لنا الجواز (صحیح مسلم ج 1 ص 116)

حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف سپردگی کمال درجے کی ہوئی اور جو تکلیف ان پر اللہ نے ڈالی اس کو دور کرنے کے لئے انہوں نے کسی سبب کو اختیار نہیں کیا اور اس حالت کی فضیلت اور اس حالت والے کی بلندی مقام میں کوئی شک نہیں ہے اور رہا نبی ﷺ کا علاج کرنا تو آپ ﷺ نے اس لئے کیا تاکہ علاج کے جواز کو بتا سکیں۔

کسی کے دماغ میں یہ اعتراض سمائے کہ علاج کے جواز کو تو زبانی بھی بتایا جاسکتا ہے پھر نبی ﷺ کے خود علاج کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو امت کے تمام طبقوں کی طرف مبعوث ہوتے ہیں اور سب کے لئے اسوہ حسنہ بنتے ہیں مذکورہ بالا حدیث کے ہوتے ہوئے جب آپ ﷺ خود علاج کو اختیار نہ کرتے تو ہو سکتا تھا کہ کوئی آپ کے زبانی ارشاد کی تاویل کر لیتا اور علاج معالجہ کو اصلاً نا جائز سمجھتا۔

تو صحابہؓ عام طور سے اس فضیلت اور بلند درجہ کی تحصیل کی خاطر دیگر اسباب علاج کی طرف اس سبب یعنی جائز تعویذ سے بھی اجتناب کرتے تھے۔

ایک اور وجہ جو ناپسند کرنے کی ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ فسادی اور شیطان قسم کے لوگوں کو تعویذ گنڈے وغیرہ کے ذریعے عوام کے عقیدے خراب کرنے کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے اور وہ عوام کی لاعلمی اور عقیدت سے فائدہ اٹھا کر شرک کی آمیزش کر دیتے ہیں اور اس کو قسم قسم کی تاویلات سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں تو باوجود قرآنی تعویذ جائز ہونے کے صحابہؓ اس خدشہ کے پیش نظر عام طور سے ان کے استعمال کو ناپسند کرتے تھے اور وہ دعا اور دم سے اپنی قوت ایمانی کی بدولت کامیاب ہوتے تھے۔

پانچواں باب

ڈاکٹر عثمانی اور ایمان خالص

ڈاکٹر عثمانی نے ایمان خالص کے نام سے دو حصوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

”گزشتہ اٹھارہ سال سے تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ وہ دن بھی لے آئے جب دنیا والوں کے سامنے میں توحیدی اور اتحادی دین کا فرق واضح کر دوں۔“

لیکن جیسا کہ سابقہ مضامین سے معلوم ہوا جو مضامین ان کی دسترس میں تھے ان کو سمجھنے کی اور ان کے بارے میں استدلال کی غلطی ظاہر ہوئی تو جس مضمون سے وہ سرے سے ناواقف

تھے اس کو چھیڑ کر تو انہوں نے اپنی نااہلیت کو بالکل کھول کر رکھ دیا ڈاکٹر عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

”شریعت کی بنیاد جس طرح تین چیزوں پر ہے قرآن حدیث و اجماع اور اس کے بعد کہیں قیاس کا نمبر آتا اسی طرح دین طریقت کی بھی تین بنیادیں ہیں جن کو اتحاد ثلاثہ کا نام دیا جاتا ہے میری خواہش یہ ہے کہ شروع ہی میں آپ کے سامنے مختصر ترین الفاظ میں دین طریقت کا لب لباب رکھ دوں اس سے واقف ہو جانے کے بعد آپ تصوف کے سلسلہ میں ہر مشکل کو چٹکیوں میں حل کر لیں گے اس اتحاد ثلاثہ کا پہلا اصول۔

1- حلول ہے

اس نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص غیر معمولی ریافتوں کے ذریعہ نفس کی صفائی اور روح کی بالیدگی پیدا کر لے یا کسی کو ورثہ میں یہ چیزیں ملی ہوں تو ذات خداوندی اس کے اندر حلول کر جاتی ہے یعنی لاہوت ناسوت میں اور موجود موجود میں اتر آتا ہے.....

اس آخری امت میں اس نظریہ کی ابتداء عبد اللہ بن سبا (یعنی یہودی جو خلافت عثمانؓ کے زمانہ میں منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہوا تھا) کے پیروؤں سے ہوئی ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ علیؑ کی ذات میں اور ان کی اولاد میں حلول کر آیا ہے اور اس طرح یہ حضرات اللہ کے اوتار ہیں پھر حلول کا یہ عقیدہ عبد اللہ بن سبا کے ماننے والوں نصیریہ کیسانہ قرامطہ اور باطنیہ سے ہوتا ہوا صوفیاء کے اندر داخل ہو گیا اور یہاں پہنچ کر وہ اصلی برگ و بار لایا.....

صوفیاء میں حسین بن منصور حلاج اس عقیدہ کے پہلے علمبردار سمجھے جاتے ہیں ان کا عقیدہ یہی تھا کہ لاہوت ناسوت میں حلول کر جاتا ہے خاص کر اپنے متعلق تو ان کا صریح دعویٰ تھا کہ مجھ میں اللہ حلول کر گیا ہے اور اسی وجہ سے وہ انا الحق کا نعرہ لگاتے تھے ”حلول مطلق“ کا یہ عقیدہ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ساری کائنات میں حلول کئے ہوئے ہے جو پہلے جہمیہ کا عقیدہ تھا حسین بن منصور حلاج اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ اس امت میں در آیا اور آج یہ دین تصوف کی رگوں کا خون بنا ہوا ہے.....

2- وحدة الوجود

اتحاد ثلاثہ کا دوسرا جز جس نے قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے خالق و مخلوق کے فرق کو

بدل ڈالا ہے وحدۃ الوجود کا نظریہ ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک ذات کے پھیلے ہوئے حصوں میں سے ایک حصہ ہے اس نظریہ کے لحاظ سے کافر و مشرک، فاسق و فاجر، مومن و مسلم، شیطان و جن، کتا و بلی، نجاست و غلاظت، سب اللہ کے عین وجود ہیں انہیں ذات الہی سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان میں اور ذات الہی میں کوئی غیریت ہے اور کائنات میں جو مختلف چیزیں نظر آتی ہیں یہ حسن و ادراک کا ظاہری پہلو وے ابن عربی جو صوفیاء میں شیخ اکبر کے نام سے پکارے جاتے ہیں اس نظریہ کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔

3- وحدۃ الشہود

اتحاد ثلاثہ کا تیسرا کلمہ ”وحدۃ الشہود“ ہے اس کو ”فنائی اللہ“ ہونا بھی کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی محبت اور ریاضت کو اس قدر فروغ دے کہ حلو یوں کی طرح اللہ تعالیٰ کو عرش سے اتار کر کسی ذات میں داخل کرنے کی بجائے خود عروج کرے اور بلند ہو کر ذات الہی میں داخل ہو جائے اور اس طرح اپنی ذات کو فنا کر کے بقا حاصل کر لے کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ ابن عربی کے وحدۃ الوجود کے مقابلہ میں شیخ علار الدولہ سمنانی المتوفی 736ھ نے ایجاد کیا ہے اور برصغیر ہندوپاک میں مجدد الف ثانی سرہندی نے اسے اوج کمال تک پہنچایا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ نظریہ شروع ہی سے تصوف کے ہر سلسلہ میں موجود رہا (ص 32 تا ص 41 ایمان خالص حصہ اول)

جواب: ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اہل حق صوفیاء کی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اصطلاحات کو جاہلوں کی نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے جس طرح دوسرے جہلان کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں اسی طرح ڈاکٹر عثمانی صاحب نے بھی باوجود یہ کہ وہ اپنے کا فاضل وفاق المدارس کہتے رہیں ان کو سمجھنے اور سمجھانے میں بری طرح ٹھوکر کھائی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ وحدت جس کا معنی واحد ہونا ہے تو واحد کے دو معنی ہیں ”ایک“ اور ”یکتا“ ناواقفوں اور جاہلوں نے ”ایک“ کے معنی لئے تو مطلب بنا لیا کہ اللہ تعالیٰ اور سب مخلوقات کا وجود ایک ہے صورتیں مختلف ہیں حقیقت میں ایک وجود ہے جس سے لازم آتا ہے کہ ہر چیز خدا ہو اور خدا ہی ہر چیز ہو چونکہ خدا تعالیٰ ازل سے ہیں قدیم ہیں تو ہر چیز ازلی اور قدیم ہو اور صفات السیہ سے ہر چیز موصوف ہو وغیرہ جب کہ اہل حق کے نزدیک وحدت

دوسرے معنی یعنی یکتا میں استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں اور ہر صفت میں یکتا ہیں کوئی مثل تو کیا ہوتا قریب بھی نہیں اور گوساری مخلوق اپنے اپنے وجود سے موجود ہے مگر حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے ان کا وجود کچھ نہیں اور ان کی صفات کے سامنے کسی کی صفات کچھ نہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت ذکر کی جاتی ہے۔

وحدة الوجود کی تحقیق

صوفیاء نے وحدت کو یکتا کے معنی میں لیا ہے اور یکتا اور بے نظیر اس کو کہتے ہیں جس کا کوئی ہمسرہ نہ ہو کہتے ہیں فلانا واحد فی الحسن واحد فی العلم وغیرہ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ دوسرا کوئی حسین یا عالم مطلقاً ہے ہی نہیں؟ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے برابر کوئی نہیں یہی مطلب وحدة الوجود کا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود کے برابر کسی کا وجود نہیں وجود حقیقی اور کامل ایک ہی ہے دوسرے وجودات اس کے سامنے اس قابل نہیں کہ ان کو وجود کہا جاسکے گو کسی درجہ میں وجود ان کا بھی ہے اور یہ مضمون قرآن و حدیث کے ذرا خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔

غرض وحدت الوجود کا یہ مطلب نہیں کہ کسی شے کا وجود ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وجود تو اغیار کا بھی ہے مگر کالعدم ہے جیسے ستارے دن میں موجود تو ہوتے ہیں جس کو اہل علم جانتے ہیں مگر آفتاب کے سامنے کالعدم ہوتے ہیں نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تھانیدار چپر اسی پر حکومت کرتا ہے اور اس وقت وہ حاکم معلوم ہوتا ہے مگر وزیر اعظم کے سامنے وہ بول بھی نہیں سکتا اس وقت اس کی حکومت کالعدم ہو جاتی ہے نیز ایک ماہر فن قاری کے سامنے ایک طفل مکتب کو کوئی قاری نہیں کہتا گو کسی قدر پڑھنا اس نے سیکھا ہی ہو۔

غرض گفتگو میں ناقص کو کامل کے سامنے لاشیٰ اور کالعدم سمجھا جاتا ہے اور یوں بھی کہا جاتا ہے کہ بس قاری تو فلانا ہے سخی تو وہ ہے۔ حسین تو یہ ہے اور ناقص سے بالکل اس کی نفی کرتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کامل کے سامنے کوئی چیز نہیں یہ معنی نہیں کہ فی نفسہ (یعنی اپنی ذات میں) بھی کچھ نہیں یہی مطلب ہے محققین کا وحدة الوجود سے کہ حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے کسی کا وجود کچھ نہیں کسی درجہ میں قابل ذکر نہیں۔ اس لئے ان کا قول ہے کہ وحدة الوجود تو ایمان ہے اور اتحاد وجود کفر ہے۔

بہر حال جب صوفیاء کے نزدیک اتحاد وجودین (دو وجودوں کا بالکل ایک ہونا) کفر ہے تو اب معلوم ہو گیا کہ محققین کے قول میں اور جہلاء کے اس قول میں کہ ہر چیز خدا ہے کتنا فرق ہے۔ وہ تو کسی شے کو موجود کہنے کے قابل بھی نہیں سکتھتے اور یہ ظالم ہر چیز کو خدا کہتے ہیں نحوذ باللہ منہ (ماخوذ از بدیعہ 74۔ البدائع۔ افادات مولانا تھانوی)

وحدة الوجود کی جو تحقیق ذکر کی گئی جب تک یہ آدمی کے علم کی حد تک رہے تو صوفیاء اس کو توحید کہتے ہیں اور جب یہ بات کسی شخص کا حال بن جائے یعنی یہ کہ اس کی مستقل کیفیت یہ بن جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے آگے دوسروں کے وجود مثل معدوم کے سمجھتا ہے تو اس کو فنا کہتے ہیں اور یہی وحدة الشہود کا حاصل بھی ہے۔

وحدة الشہود کی تحقیق

اس کا ترجمہ ہے مشہود کا ایک ہونا یعنی واقع میں تو ہستی اور موجود متعدد ہے مگر سائل کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور باقی سب کا عدم معلوم ہوتے ہیں۔
شیخ سعدی نے اس کی ایک مثال لکھی ہے۔

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ
بتابد بشب کریم چوں چراغ
یکے گفتش اے کریم شب فروز۔
چہ بودت کہ پیروں نیائی بروز
نہ بینی کہ اں کریم خاک زاد
جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز و شب جز بہ صحرائیم
ولے پیش خورشید پیدا نیم

شاید تم نے دیکھا ہوگا کہ باغ وغیرہ میں ایک کیڑا چراغ کی طرح چمکتا ہے۔

کسی نے اس سے کہا کہ اے رات کو روشن ہونے والے کیڑے تجھ کو کیا ہوا کہ تو دن میں باہر نہیں آتا۔

تمہیں خبر نہیں کہ اس خاک کے کیڑے نے جواب عقلمندی سے کیا عمدہ دیا۔

کہ میں تو دن رات جنگل کے سوا کہیں نہیں ہوتا مگر سورج کے سامنے میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ غرض جن لوگوں کی نظر آفتاب (وجود حقیقی) پر ہوتا ہے اس وقت جگنو یعنی اشیاء عالم کا وجود ان کو نظر نہیں آتا۔ ہاں جو لوگ اندھیرے میں ہیں جن کی نظر سے آفتاب وجود حقیقی غائب ہے وہ البتہ اشیاء عالم کے وجود پر نظر رکھتے ہیں اور جو محقق ہیں کہ مغلوب الحال نہیں ہیں ان کی نظر آفتاب وجود حقیقی پر ہونے کے ساتھ مخلوق پر بھی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں حقیقی نہیں بلکہ صرف لفظی اختلاف سے مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے اس لئے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا۔ (الکشف ص 114)

حلول کی تحقیق

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے صوفیاء کی طرف عقیدہ حلول کی نسبت کی ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ اہل حق صوفیاء صرف وحدت کے قائل ہیں اتحاد کے قائل نہیں ہیں کہ عالم موجود ہو پھر ذات حق کے ساتھ وجود میں متحد (ایک) ہو اس سے حلول کی نفی ہوتی ہے کیونکہ حلول میں حال (حلول کرنے والا) اور محل (جس میں حلول کرے) دونوں موجود ہوتے ہیں پھر ان میں ایک نوع کا اتحاد ہو جاتا ہے جب کہ یہ حضرات عالم کے وجود کو ذات حق کے وجود کے سامنے کالعدم جانتے ہیں۔ (ابوادر النوار مولانا تھانویؒ)

اب ہم ڈاکٹر عثمانی صاحب کی کتاب ”ایمان خالص“ سے چند باتیں نقل کرتے ہیں جن کو ڈاکٹر عثمانی صاحب نے شرک خیال کیا ہے اور ایمان خالص کے مخالف سمجھا ہے۔

پہلی مثال

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں ”حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ جب فرزند عزیز صلاح الدین بیمار ہوا اور ہم نے اس کی زندگی سے ہاتھ دھو لئے تو میں نے کفن خریدنے اور قبر کھودنے کے لئے کہہ دیا اچانک میرے دل میں جوش آیا اور ایک کونے میں جا بیٹھا حد سے زیادہ گڑ گڑا کر دعا مانگی فرشتے نے آ کر اس کی زندگی اور صحت کی بشارت دی اسی دم وہ چھینکا اور اس کی زندگی لوٹ آئی۔“ (ص 58 ایمان خالص)۔

اس قصے میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کے لئے جو بات قابل اعتراض ہو سکتی ہے وہ فرشتے کا آ

کر بشارت دینا ہے لیکن ڈاکٹر عثمانی صاحب قرآن پاک کی کوئی آیت یا کوئی حدیث ایسی بتا دیں جس سے معلوم ہو کہ غیر نبی کے لئے ایسا ہونا جائز نہیں ہے جب کہ اس کے برعکس ہم قرآن پاک اور حدیث میں دیکھتے ہیں کہ غیر نبی کے پاس بھی فرشتہ آیا اور کلام بھی کیا ہے قرآن پاک میں حضرت مریم علیہا السلام کا قصہ مشہور ہے کہ فرشتے نے آکر ان سے کلام کیا۔

فارسلنا الیہا روحنا فتمثل لہا بشرا سویا قالت انی اعوذ بالرحمن منک

ان كنت تقیاً قال انما انا رسول ربک لا ھب لک غلاماً کیا (سورہ مریم)

پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اس کے آگے آدمی پورا بولی مجھ کو رحمن کی پناہ تجھ سے اگر ہے تو متقی۔ بولا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رب کا کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا اور فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سے کلام کیا۔

قالت یولتسیء الدوانا عجوز و هذا یعلی شیخا ان هذا الشئى عجیب قال

اتعجبین من امر اللہ رحمت اللہ و برکتہ علیکم اهل البيت انه حمید مجید

(سورہ ہود رکوع 7)

بولی ہائے خرابی کیا میں بچہ جنوں کی حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ خاوند میرا بوڑھا یہ تو ایک عجیب بات ہے وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے اللہ کی رحمت سے اور برکتیں تم پر اے گھر والو بے شک اللہ ہے تعریف کیا گیا بڑائیوں والا۔

علاوہ ازیں ایک حدیث جبرائیل کے نام سے مشہور ہے اس کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آئے صحابہؓ آپ کی گرد بیٹھے تھے یہ آکر نبی ﷺ کے سامنے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گئے اور ایمان اسلام اور علامات قیامت سے متعلق سوال کئے صحابہ جن میں حضرت عمرؓ بھی تھے انہوں نے حضرت جبرائیل کو انسانی شکل میں دیکھا اور ان کو سوال کرتے سنا۔

دوسری مثال

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں ”حضرت والد ماجد جب ساٹھ سال کے ہوئے تو ان پر منکشف ہوا کہ تقدیر کے فیصلے کے مطابق آپ کے ہاں ایک اور فرزند پیدا ہوگا بعض خاص یاران طریقت سے یہ بھی سننے میں آیا کہ آپ کو بشارت دی گئی تھی کہ وہ نومولود علمی اور روحانی بلند مقامات کو

بچے گا چنانچہ آپ کے دل میں شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا جب محدومی شیخ محمد نے یہ ماجرا سنا تو وہ اس کوشش میں رہنے لگے کہ یہ بچہ ان کی لخت جگر سے ہو اس فقیر نے بعض ثقہ لوگوں سے سن رکھا ہے کہ جب اس شادی کی بات پکی ہوگئی تو بعض مخالفین اور منافقین نے کہا کہ اس عمر میں شادی مناسب نہیں رہے گی حضرت والد نے ان کی باتیں سنیں اور فرمایا کہ میری عمر کا ابھی کافی حصہ باقی ہے اور لڑکے بھی پیدا ہوں گے چنانچہ آپ اس شادی کے سترہ سال بعد زندہ رہے اور دو بچے بھی پیدا ہوئے فقیر (ولی اللہ) ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ ایک رات حضرت والد ماجد نماز تہجد پڑھ رہے تھے اور میری والدہ بھی ان کے قریب تہجد میں مشغول تھیں نوافل کے بعد حضرت والد نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور والدہ آمین کہتی رہیں اسی اثناء میں دو اور ہاتھ ظاہر ہوئے حضرت والد نے فرمایا یہ دو ہاتھ ہمارے بیٹے کے ہیں جو پیدا ہوگا وہ ہمارے ساتھ دعا مانگ رہا ہے اس کے بعد یہ فقیر پیدا ہوا اور سات سال کی عمر میں نماز تہجد میں والدین کا ساتھی بنا اور اسی خواب والی وضع میں ان دونوں کے درمیان ہاتھ اٹھائے (ص 58/59 ایمان خالص پہلا حصہ)

اس قصے میں کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے کہ جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو کیا آئندہ ہونے والے واقعہ کا بذریعہ کشف علم ہو جائے تو اس کو علم غیب کہتے ہیں کشف بھی علم کا ایک ذریعہ ہے جیسے وحی اور حواس علم کا ذریعہ ہیں جو بات کسی ذریعہ سے معلوم ہو وہ علم غیب نہیں ہوا خاص طور سے جب کہ وہ ذریعہ بھی قدرت خداوندی میں ہو کہ اللہ چاہیں تو کشف ہو جائے اور چاہیں تو نہ ہو علم غیب تو وہ ہوتا ہے جو کسی ذریعہ کا محتاج نہ ہو اور وہ ذات جو علم غیب بھی رکھے اس کی قدرت میں ہو کہ وہ جب چاہے معلومات حاصل کر لے اور ظاہر ہے کہ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور علم غیب نہیں رکھتا خواہ وہ نبی ہو یا ولی ہو کہ یہ خاصہ خداوندی ہے۔ دیکھئے قرآن پاک میں ہے۔

ولما فصلت العیر قال ابوہم انی لا جد ریح یوسف لو لا ان تغندون۔

”اور جب جدا ہوا قافلہ کہا ان کے باپ میں پاتا ہوں بو یوسف کی اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا

بہک گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کوئی نبی تو نہیں تھیں کہ ان پر وحی نبوت ہوئی ہو بلکہ ان

کے دل میں مطلوبہ بات جمادی گئی۔ تو یہ بھی ذریعہ علم ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو جو علم حاصل ہوا وہ علم غیب شمار نہیں ہوتا۔

ایسے ہی کشف ہے۔

اسی طرح دیکھئے حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں بیٹھے ہوئے ہیں کشف ہوا کہ مسلمان لشکر کے ساتھ ہزیمت کا معاملہ ہو رہا ہے تو فرمایا یا ساریہ الجبل (اے ساریہ پہاڑ کو اوٹ بناؤ) آخر یہ کشف ہی تو تھا علم غیب تو نہیں تھا دور کی بات جب کشف سے حاصل ہو سکتی ہے اور وہ غیب نہیں کہلاتی تو آئندہ کی کوئی بات کشف سے معلوم ہو جائے تو اس کے مانع کوئی آیت و حدیث ہے جب کہ وہ ان پانچ مغیبات میں سے نہ ہو جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب اعتراض کے طور پر لکھتے ہیں ”شاہ عبدالرحیم صاحب نے یہ فرمایا کہ ابھی میری کافی عمر باقی ہے اور لڑکے بھی ہوں گے اس کلیہ کو ختم کر دیا کہ کسی کو اپنی عمر اور اولاد کے بارے میں کل کی خبر نہیں۔“

مغیبات خمسہ میں سے ایک یہ تو ہے کہ آدمی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کسب کرے گا لیکن یہ تو بالکل کھلی بات ہے کہ عمر کتنی ہوگی اور بات ہے اور آدمی کل کیا کسب کرے گا اس سے جدا بات ہے دونوں کو ایک بنا دینا اور پھر اس کو شریعت کا قاعدہ کلیہ قرار دینا تو دین میں اپنی طرف سے اختراع کرنا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے جب وحدت کو اتحاد بنا دیا اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی تفسیر اہل حق سے لینے کے بجائے جاہلوں اور گمراہوں کی بات پر اعتماد کیا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ صوفیاء تو خدائی کا دعویٰ رکھتے ہیں..... حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے..... اس لئے انہوں نے صوفیاء کی ہر بات کو خدائی رنگ میں دیکھنا شروع کر دیا اور ان کو جو جتنا بڑا شیخ اور صوفی نظر آیا اس کے اندر شرک بھی اسی تناسب سے زیادہ نظر آیا ڈاکٹر عثمانی صاحب نے جب اپنی آنکھوں پر غلط فہمی بلکہ بد فہمی کی عینک چڑھا لی ہے تو اب ان کو اسی طرح نظر آتا ہے اس کا علاج تو بس یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس عینک کو ہٹالیں اور حقائق جیسے ہیں ان کو اسی طرح دیکھنے کی کوشش کریں۔

تیسری مثال

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں ”قطب ارشاد اور اس کا فیضان عام“ قطب ارشاد جو فردیت کے کمالات کا بھی جامع ہوتا ہے بہت ہی کم پایا جاتا ہے بہت صدیوں اور زمانوں کے بعد اس انداز کا کوئی جوہر ظاہر ہوتا ہے اور یہ دنیاۓ تاریک اس کے ظہور کے نور سے منور ہو جاتی ہے اور اس کی ارشاد و ہدایت کا نور ساری دنیا کو محیط ہو جاتا ہے عرش کے دائرہ سے زمین کے مرکز تک جس کو بھی رشد ہدایت ایمان اور معرفت حاصل ہوتی ہے اسی کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کی ذات سے مستفاد ہوتی ہے اس کے واسطے کے بغیر کوئی شخص بھی اس دولت تک رسائی نہیں پاسکتا۔ مثال کے طور پر اس کا نور ہدایت ایک بحریکراں کی صورت میں پوری دنیا کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہوتا ہے اور وہ دریا گویا کہ منجمد (جمہا ہوا اور بستہ) ہے کہ اس میں مطلقاً کوئی حرکت نہیں جو شخص اس بزرگ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اخلاص رکھتا ہے یا یہ کہ وہ بزرگ خود کسی طلبگار کے حال پر متوجہ ہو جائے تو اس توجہ کے دوران گویا کہ ایک سوراخ اس طلبگار کے دل میں کھل جاتا ہے اور اس راستہ سے جس قدر توجہ اور اخلاص ہوتا ہے اسی قدر وہ اس دریا سے سیراب ہوتا جاتا ہے اسی طرح وہ شخص بھی جو ذکر الہی جل شانہ کی طرف متوجہ ہے اور اس عزیز بزرگ کی طرف متوجہ نہیں ہے لیکن اس کی بے توجہی کسی انکار کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اس بزرگ کو پہچانتا ہی نہیں ہے تو اسی اندازہ کی فیض رسانی اسے بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ فیض رسانی پہلی صورت میں دوسری صورت سے زیادہ ہوتی ہے۔

قطب الارشاد کا انکار

البتہ جو شخص اس بزرگ کا منکر ہو یا اس بزرگ کو اس شخص سے کوئی گرائی ہو تو کتنا ہی ذکر الہی تعالیٰ و تقدس میں مشغول رہا کرے لیکن وہ رشد و ہدایت کی حقیقت سے محروم ہی رہتا ہے بغیر اس کے کہ وہ بزرگ اس شخص کو فیض نہ پہنچانے کا کوئی ارادہ کرے یا اسے نقصان پہنچانے کا قصد کرے اس کا یہ انکار ہی اس کے فیض کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے ہدایت کی حقیقت اس کو حاصل نہیں ہوگی جو کچھ حاصل ہے وہ ہدایت کی صورت ہے بلا حقیقت کے صرف صورت سے لوگوں کو بہت کم نفع پہنچتا ہے۔

قطب الارشاد سے اخلاص

اور جو گروہ اس بزرگ کے ساتھ اخلاص و محبت رکھتا ہے خواہ وہ توجہ مذکور اور ذکر الہی تعالیٰ شانہ سے کتنا ہی خالی کیوں نہ ہو ایسے لوگوں کو بھی محض ان کی محبت کی وجہ سے رشد و ہدایت کا نور حاصل ہو جاتا ہے والسلام علی من اتبع الہدی (جو لوگ ہدایت کی پیروی کریں ان پر سلامتی ہو) (ص 77/78 ایمان خالص حصہ اول)

ڈاکٹر عثمانی صاحب اتحاد اور حلول کی غلط فہمیوں سے نکل کر بتائیں کہ مضمون کس طرح سے قرآن و حدیث کے مخالف ہے۔ وہ لوگ جو رشد و ہدایت کے کام میں لگے ہوئے ہیں ان کی استعدادیں اور ان کے درجے مختلف ہوتے ہیں ایسے کسی ایک شخص کو بھی مخالفت مضر ہوتی ہے کجا کہ اس کی مخالفت جو رشد و ہدایت میں اونچا مرتبہ رکھتا ہو اس کے ساتھ تعلق اور خلوص رکھنا یقیناً اپنی ہدایت میں قوت و اضافہ کا موجب ہوتا ہے اور اس کے ساتھ انکار و عداوت کا معاملہ رکھنا جس کا منشاء محض نفس پرستی یا دنیا طلبی ہو یقیناً ہدایت میں کمزوری کا سبب ہوگا۔

رہا ڈاکٹر عثمانی صاحب کا یہ کہنا کہ ”اللہ بتاؤ کہ آج کا قطب ارشاد کون ہے مبادا اس کی شان میں کوئی گستاخی سرزد ہو جائے اور انسان کہیں کا نہ رہے“ تو ڈاکٹر عثمانی صاحب کو اس اقتباس کے شروع کا جملہ دوبارہ پڑھ لینا چاہئے تھا جو یہ ہے ”قطب ارشاد..... بہت ہی کم پایا جاتا ہے بہت صدیوں اور زمانوں کے بعد اس انداز کا کوئی جوہر ظاہر ہوتا ہے“۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ آج کے قطب ارشاد بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے سلسلہ کے حضرت سید احمد شہیدؒ ہیں تو غلط نہیں ہے اور ڈاکٹر عثمان صاحب نے ان کی شان میں (بلکہ آسمان رشد و ہدایت کے مہ و خورشید اور دیگر روشن ستاروں کی شان میں) گستاخی کر کے اپنے آپ کو کہیں کا نہ چھوڑا ہمارا یہ رسالہ اس بات پر کواہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں سے ایسی ہی بے عقلیاں اور غلطیاں ہوتی ہیں جیسی کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب سے سرزد ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اپنی عافیت میں رکھیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔